اور وہ مدارج اپنی اپنی جگہ کون سے تاریخی تقاضے رکھتے ہیں؟

ان تقاضوں نے ہماری عملی زندگی میں معیاری اسلام سے اس قدر بُعد کیوں پیدا کر دیا ہے؟

وہ کون سے مؤثرات ہیں جنہوں نے معیاری دین سے معمول بہ دین کو اس درجہ مختلف بنا دیا ہے کہ ہمارا اعتماد متزلزل ہو کر رہ گیا ہے؟

جب تک ان مسائل کا حل مہیا نہ کیا جائے، نوجوانوں کا اعتماد قوم کے مستقبل کی نسبت بحال ہو سکتا ہے نہ مناسب نصاب تیار ہو سکتا ہے، نہ پاکستان کی ترقی کی خاطر مذہبی اور اخلاقی، سیاسی اور معاشی، معاشرتی اور تعلیمی اعتبار سے جدوجہد کا کوئی رخ متعین ہو سکتا ہے۔

ہو صداقت کے لیے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکر خاکی میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمان مستعار
اور خاکستر سے اپنا جہاں پیدا کرے
زندگی کی قوت پنہاں کو کر دے آشکار
تا یہ چنگاری فروغ جاوداں پیدا کرے
خاک مشرق پر چمک جائے مثال آفتاب
تا بدخشاں پھر وہی لعل گراں پیدا کرے
سوئے گردوں نالہ شب گیر کا بھیجے سفیر
رات کے تاروں میں اپنے رازداں پیدا کرے
یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصہ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

شلوار اور پتلون کے پائنچوں کا شرعی حکم
ایک تحقیق

محمد عارف خان ساقی
لیکچرار شعبہ علوم اسلامی، جامعہ کراچی

ہمارے سامنے ''بچوں کا اسلام'' نامی رسالے کا ۲۲ دسمبر ۲۰۰۲ء کا شمارہ ہے۔ ''خوفناک'' کے زیر عنوان اس میں ایک مضمون طبع ہوا ہے۔ جو جنید زید صاحب کی تحریر ہے۔ مضمون نہایت پراثر اور پرمغز ہے۔ ایک اہم شرعی مسئلے کو جو عرصے سے ہمارے عوام میں موضوع بحث ہے، کہانی کے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ بہت مختصر مگر جامع۔ مضمون نگار نے اسے دلنشین اور ہمہ جہت بنانے کی پوری کوشش کی ہے اور بڑی حد تک اپنے اس مقصد میں وہ کامیاب بھی رہے ہیں۔ ہمیں اس لحاظ سے بھی یہ انداز اچھا لگا کہ مذہبی اور معاشرتی اقدار کا بارِ امانت نئی نسلوں کو منتقل کرنے کا آج یہی خوبصورت ترین طریقہ اور ذریعہ ہے۔ تاہم مضمون میں ایک سنگین غلطی بھی موجود ہے۔ مضمون نگار کا اس معاملے میں کوئی قصور بھی نہیں کہ انہوں نے تو وہی لکھا اور نئی نسل کو پہنچایا جو پچھلی نسل نے ان کو دیا تھا۔ اسی طرح اس نسل کو بھی ان کے اگلوں نے مسئلے کی نوعیت شاید یہی بتائی تھی۔ اس کی ہیئت کب بدلی اور مسلمہ قوانین اور طے شدہ اصولوں کو اس معاملے میں کیوں پامال کیا گیا؟ کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ تاہم اتنا ضرور ہے کہ کھلے ذہن کے ساتھ شریعت کے

رہنما اصولوں کو قبول کرنے سے انحراف کرتے ہوئے محض دیکھا دیکھی کی روایت وہٹ پر اڑے رہنا ہم میں سے کسی کے لیے بھی سود مند نہیں ۔ اب بھی وقت ہے خالی الذہن ہو کر اسلامی تعلیمات کا بغور مطالعہ کیا جائے۔ پہلے سے تیار اور رواج پذیر نظریات اور رویوں کو قرآن وحدیث سے تحفظ مہیا کرنے کا بے سود تکلف نہ کیا جائے تو بات بن سکتی ہے۔ ممکن ہے پچھلوں کی روایت اور اپنی برسوں پرانی عادت کسی کے دل میں انا کا بیج ڈال دے۔ تبدیلی کو طبیعت گوارا نہ کر سکے۔ بقول اقبال۔

برائی کی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں

صورت حال اگر یہ رخ اپنا لیتی ہے تو اس نیکی کی حیثیت فریب نظر سے زیادہ کچھ نہیں رہے گی۔ یہ شیطانی دام ہم رنگ زمیں ہوگا۔ آدمی جس برائی سے بچنے کے لئے یہ ساری تگ ودو کر رہا ہے، عین اسی برائی میں جا پڑنے والی بات۔ حدیث ذیل پہ ذرا اطمینان کے ساتھ غور کیجئے۔ حضور رسول اکرم ﷺ نے اس کے ذریعہ اپنی امت کو کیا پیغام دیا ہے:

ان رجلا اتی النبی ﷺ وکان رجلا جمیلا فقال یا رسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم انی رجل حبب الی الجمال واعطیت منہ ماتراہ۔ حتی ما احب ان یفوقنی احد اما قال بشراک نعلی واما قال بشسع نعلی افمن الکبر ذالک ؟ قال: لا! ولکن الکبر من بطر الحق وغمط الناس۔ (سنن ابی داؤد، کتاب اللباس، باب ماجاء فی الکبر)

ترجمہ: ایک آدمی نبی اکرم ﷺ کے پاس حاضر ہوا۔ وہ خود بھی خوبصورت آدمی تھا۔ تو کہنے لگا: یارسول اللہ ﷺ! خوبصورتی مجھے بیحد محبوب ہے اور آپ ﷺ ملاحظہ بھی فرما رہے ہیں کہ مجھے اس میں سے حصہ بھی خوب ملا ہے، یہاں تک کہ میں نہیں چاہتا کہ کوئی اور شخص جوتی کے تسمے کے برابر بھی مجھ سے برتر ہو جائے۔ آیا یہ تکبر ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں! تکبر تو یہ ہے کہ کوئی حق کے مقابلے میں اپنی ہٹ پر قائم رہے اور دوسرے لوگوں کو کمتر سمجھے۔

ترمذی کی روایت قدرے مختلف الفاظ کے ساتھ ہے اور آخر میں ہے:

ان اللہ یحب الجمال ولکن الکبر من بطر الحق وغمص الناس

(جامع ترمذی، ابواب البر والصلۃ، باب ماجاء فی الکبر)

ترجمہ: طے شدہ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ خوبصورتی کو پسند کرتا ہے۔ لیکن تکبر یہ ہے کہ کوئی حق کے مقابلے پر اڑا رہے اور لوگوں کو حقیر سمجھے۔

سعادت ونجات صرف شریعت کی پیروی میں ہے اور بے احتیاطی یا کسی معمولی غلطی کے نتیجے میں فروغ حاصل کر لینے والے افکار وخیالات شریعت کے رخ روشن کا حجاب ہو جاتے ہیں۔ اس طرح گوہر مقصود تو نظر سے اوجھل ہی ہو جاتا ہے اور سایوں کے تعاقب کی بے سود مشقت اور بے فیض ریت گلے پڑ جاتی ہے۔ بدقسمتی سے زیر بحث مسئلے میں بھی ہمارے انداز اب تک یہی کچھ رہے ہیں۔ بقول شاعر

جو جمال روئے حیات تھا جو دلیل راہ نجات تھا
اسی راہبر کے نقوش پا کو مسافروں نے مٹا دیا

آج یہ نظریات ایک وبا کی طرح پھیل چکے ہیں اور ہر مسجد میں نمازی حضرت اپنے ساتھی نمازیوں کو نماز شروع ہونے سے قبل اثنائے تکبیر میں اسی کی تلقین کرتے نظر آتے ہیں۔ گویا شریعت اور نماز کی صحت کا دارومدار اسی پر رہ گیا ہے۔

یا شلوار!

مضمون میں بحث کی شروعات اس جملے سے ہو رہی ہے: ''جب بھی آپ کو دیکھا آپ کی شلوار ہمیشہ ٹخنوں سے نیچی نظر آئی''۔ پھر اپنے سامع یا قاری کو خوف میں مبتلا کرنے کے لئے یہ جملہ کتنا بھاری بھرکم ہے۔ ''اور مشکل یہ ہے یہ کہ کوئی معمولی گناہ نہیں جس کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہی نہ ہو، یہ بہت خوفناک گناہ ہے''۔ اگلی سطور میں یہ تک صراحت کر دی گئی کہ ''کوئی غرور سے لٹکائے یا بغیر غرور کے یہ کبیرہ گناہ ہے''۔

یہ زہر کس خاموشی سے اور کیسے دھیرے دھیرے رگوں میں اترتا رہا اور سرائیت کرتا رہا یوں اندازہ کیجئے کہ بطور دلیل پیش کی گئی پہلی حدیث میں جہاں صرف تہمد کا ذکر تھا، حدیث کا ترجمہ بدل کر یوں کر دیا گیا: ''پھر آپ ﷺ نے فرمایا تہبند یا شلوار وغیرہ کو ٹخنوں سے نیچے لٹکانے والا''۔

یہاں ''یا شلوار وغیرہ'' کے اضافے کو ہم احتیاطاً تحریف تو نہیں کہتے۔ البتہ یہ مغالطہ آرائی یا کم از کم غلط فہمی ضرور ہے۔ حدیث میں اس طرح کے اضافے کسی بھی طرح روا قرار نہیں دیے جا سکتے۔ اہل علم پر مخفی نہیں کہ واحد متفق علیہ متواتر حدیث کا تعلق اسی باب سے ہے۔ ہم کسی بھی مسلمان کے بارے میں یہ گمان تک نہیں کر سکتے کہ وہ دیدہ دلیری کے ساتھ حضور اکرم ﷺ کی طرف کوئی ایسی بات منسوب کرے گا جو آپ ﷺ نے کہی ہی نہ ہو اور یوں اپنے آپ کو حدیث متواتر میں وارد وعید کی زد میں جھونک دے گا۔ آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

من كذب علي متعمدا فليتبوأ مقعده من النار.

(صحیح بخاری، جلد اول، کتاب العلم، باب اثم من کذب علی النبی ﷺ و صحیح مسلم، مقدمہ، باب تغلیظ الکذب علی رسول اللہ ﷺ)

ترجمہ: جس نے جان بوجھ کر جھوٹی بات مجھ سے منسوب کی وہ جہنم میں اپنے ٹھکانے کی تیاری کر لے۔

چنانچہ غیر ارادی طور پر ہی سہی بہر حال اب کا نٹا تو تبدیل ہو گیا ہے۔ لہٰذا اگلی احادیث میں کام قدرے آسان ہو گیا ہے۔ کہیں ''تہبند وغیرہ'' کہیں ''کپڑے'' اور کہیں ''لباس'' کہہ کر غلط پٹری پہ ڈالی گئی اور اب غلاست میں رواں دواں ٹرین کے سارے سگنل کلیئر کر دیے گئے۔ ازیں بعد اس گناہ کو گیارہ گناہوں کا مجموعہ قرار دیا گیا ہے۔ جن میں سے ایک ''واضح احادیث کا انکار'' ہے۔ اسی طرح یہ بھی ایک ہے کہ یہ کافروں، مغروروں اور گناہگاروں سے مشابہت ہے۔ الامان والحفیظ۔

یہ واضح رہے کہ یہ عمل مسلمانوں کے کسی خاص مکتبہ فکر، طبقے یا گروہ کی علامت یا امتیاز نہیں ہے۔ بلکہ بلا امتیاز بہت سے سادہ لوح لوگ اس علت میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ سب سے زیادہ تکلیف دہ امر یہ ہے کہ ارباب فضل و کمال میں سے کچھ تو اسی دھارے میں بہہ رہے ہیں باقی مکمل خاموش۔ ممکن ہے کہ آج بھی کسی کو ''عموم بلویٰ'' کا اندیشہ چپ رکھے ہوئے ہو۔ یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ ہمارا پیش نظر مقصد متذکرہ مضمون کا جواب لکھنا ہرگز نہیں۔ صرف گرد جھاڑنا اور صحیح شرعی حکم کی اصل ہیئت کو واضح اور بحال کرنا ہے۔

عہد رسالت میں لباس کی نوعیتیں

نفس مسئلہ کی وضاحت سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ لباس کے کم سے کم ان پہلوؤں کے حوالے سے عہد رسالت علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے طور طریقوں اور رسوم و رواج پر ایک سرسری نظر ڈال لی جائے جن کا ہمارے موضوع سے براہ راست تعلق ہے۔ زیریں جامہ کے طور پر عہد اقدس میں دو طرح کے لباس تھے۔ ایک سروال کہلاتا، جبکہ دوسرا ازار کے نام سے موسوم تھا۔ سروال، شلوار اور پاجامے کو کہتے ہیں۔ یہ عرب ثقافت پر ہندی اثرات کی قدیم علامات اور نشانیوں میں سے ایک ہے۔ غالب گمان یہی ہے کہ پہلے پہل عہد اقدس سے بھی بہت پہلے، ہندوستان آنے والے تاجروں نے اسے اپنایا اور پہنا۔ یہ اہل ہند کی مقامی موسمی ضرورتوں کو بھی پورا کرتا ہے اور ستر و لباس کی ضرورت بھی اس سے من احسن الوجوہ پوری ہو رہی تھی۔ مزید برآں خطرات کم سے کم تھے۔ یہی کچھ وجوہات رہی ہونگی کہ عرب تجارتی قافلوں نے نہ صرف اسے عرب پہنچایا بلکہ عہد رسالت تک عرب ثقافت میں یہ اپنا مقام پیدا کر چکا تھا۔ نام کے معاملے میں بھی عربوں نے اس کے ساتھ خاصا روادارانہ برتاؤ کیا اور اس کے ہندی نام ''سلوار'' جسے آج ہم ش کے ساتھ شلوار کہتے ہیں، ہی کو حروف کے معمولی ہیر پھیر کے ساتھ سروال بنایا اور اس کے نام کر دیا۔ معروف محقق و تاریخ نگار ڈاکٹر حمید الدین عربوں کے تہذیب و تمدن پر بیرونی اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کئی چیزوں مثلاً سکہ، چراغ، کوزہ، پاجامہ وغیرہ کے لیے ان کی اپنی زبان میں الفاظ نہیں تھے''۔

(تاریخ اسلام، باب اول، تمدنی حالت، صفحہ ۴، فیروز سنز۔ لاہور)

معروف سیرت نگار و محقق علامہ شبلی نعمانی فرماتے ہیں:

''پائجامہ کو سروال کہتے ہیں جو شلوار کی بگڑی ہوئی صورت ہے'' (سیرت النبی، جلد اول، تاریخ عرب قبل اسلام، تہذیب و تمدن، صفحہ ۸۰، دارالاشاعت۔ کراچی)

اس سے صاف عیاں ہے کہ عرب معاشرہ عہد جاہلیت کے طور طریقوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے مسلسل ہاتھ پاؤں مارتا رہا۔ دیگر تمام ترقی پذیر معاشروں کی طرح عہد رسالت سے قبل بھی مدت مدید تک تبدیلیوں کی زد میں رہتے ہوئے تہذیب و تمدن کی جانب اس

کی پیش قدمی جاری رہی۔ خانہ بدوش قبائل بھی تہذیب وتمدن کی اعلیٰ اور منظم اقدار سے بتدریج متاثر ہوتے رہے۔

تبدیلی کی اس لہر نے عربوں کے رہن سہن کے اطوار، لباس، طرز تعمیر اور زبان سمیت ہر شعبۂ زندگی کو متاثر کیا اسلام کی آمد اور ستر پوشی کی غیر معمولی اہمیت کی وضاحت کے بعد زندگی کے تمام شعبوں میں سرگرم تبدیلیوں کی لہر میں بالعموم اور لباس کے معاملے میں پاجامے کی اہمیت و مقبولیت میں بالخصوص بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ عہد رسالت میں ہی شرفاء اور معززین تک اسے زیب تن کرنے لگے تھے۔

کوئی بھی معاشرہ نہ تو چٹکی بجاتے میں اپنی کسی دیرینہ روایت کو ترک کر سکتا ہے اور نہ ہی کسی نئی روایت کو اپنا سکتا ہے۔ تجربات جب تحفظات کو غلط ثابت کر دیتے ہیں تو نئی روایت سے وابستگی باعث خطر و عار نہیں رہتی۔ نہ ہی اپنی تہذیبی و ثقافتی اقدار سے بغاوت شمار ہوتی ہے۔ یہ ماحول اور موسم نئی روایت کی بہتر نشوونما کے لئے سازگار حالات پیدا کر دیتے ہیں۔ نو وارد روایت سے اجنبیت کا رجحان کمزور ہو جاتا ہے اور اسے اپنانے والوں کی تعداد میں اضافہ روز افزوں ہوتا جاتا ہے۔ خصوصاً جبکہ وابستگی باعث عار نہ رہے تو آخری رکاوٹ بھی تبدیلی کی لہر کے آگے سرنگوں ہو جاتی ہے۔

ذرا ماضی کے جھروکوں میں جھانکیئے! ماضی قریب میں ہمیں بھی اس نوع کی ایک تبدیلی کا سامنا رہا ہے۔ یہاں شلوار اور پتلون باہم مدمقابل تھے۔ ہم نے اپنے لوگوں کی پتلون سے نفرت و بیگانگی کو بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب یہ خالص انگریز وضع اور سامراج کی علامت شمار ہوتی تھی۔ اور مفتوح قوم اپنے غیر ملکی حکمرانوں سے نفرت کے اظہار کے لیے اپنے سپوتوں کو ان کی وضع قطع اپنانے سے دور رکھنے اور بچانے کے لیے سرگرم اور فکرمند تھی۔ ہوتے ہوتے آج یہ ہر گھر کے نوجوانوں کا مقبول ترین لباس ہے۔

فرمان رسول اکرم ﷺ: من تشبه بقوم فهو منهم

(ابوداؤد، حصہ دوم، کتاب اللباس، باب ماجاء فی الاقویۃ صفحہ ۲۰۳، مکتبہ حقانیہ، ملتان)

ترجمہ: جو شخص دانستہ کسی اور قوم کے افراد سا دکھنا چاہے گا، وہ انہی میں شمار ہوگا۔

Seminar Library
Department of Islamic History
University of Karachi

ادھر عرصے تک زبان زد خاص و عام رہا۔ اُدھر پتلون کا نفوذ و رسوخ بھی بڑھتا رہا۔ حرمت، کراہت تحریمی، کراہت تنزیہی، جواز اور قبولیت یہ اس کے سفر کے اہم مرحلے تھے۔ اب تو ہر کوئی اپنا سا لگنے کی کوشش میں ہے یا زیادہ سے زیادہ اپنوں سا، غیروں کی سی اب وہ بات کہاں؟ ہم تو یوں بھی پتلون کے مداح ہیں کہ اس کے باعث طویل عرصے تک خواص تو کیا عامیوں کو بھی محولہ بالا فرمان رسالت مآب ﷺ از بر رہا۔ رہا معاملہ شلوار کا تو اسے خراج تحسین پیش نہ کرنا بھی بڑا بخل ہوگا کہ مقابلہ تو دل ناتواں نے خوب کیا۔

ایسے آثار اور شواہد بہت ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ عہد رسالت میں ہی پاجامے کا رواج عام ہو چلا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ سامنے کی ایسی چیز جسے ہر کوئی کھلی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہو، کا لفظوں میں تذکرہ کوئی نہیں کرتا۔ کرتا بھی ہے تو بالتبع اور کسی دوسرے حوالے سے۔ جبکہ تاریخ لفظی شہادت کو زیادہ ٹھوس خیال کرتی ہے۔ ایسے میں یہ فرض کر لینا کہ کچھ تھا یا ہوا ہی نہیں بے معنی سی حرکت ہے۔ لہٰذا ہمیں یہ کہنے میں کچھ باک نہیں کہ کم سے کم بعض کبار صحابہ کرام نے سروال کو اپنے لباس کا حصہ بنا لیا تھا۔ امام احمد بن حنبل رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ اپنی مسند میں روایت کرتے ہیں:

عن نعيم المجمر انه قال رقيت مع ابى هريرة على ظهر المسجد وعليه سراويل من تحت قميصه فنزع سراويله ثم توضأ و غسل وجهه ويديه ورفع فى عضديه الوضوء ورجليه فرفع فى ساقيه ثم قال انى سمعت رسول الله ﷺ يقول ، ان امتى يأتون يوم القيمة غرا محجلين من اثار الوضوء فمن استطاع منكم ان يطيل غرته فليفعل. (مسند احمد بن حنبل، جلد ۳، صفحہ ۱۱۴، احیاء التراث العربی، بیروت)

ترجمہ: نعیم المجمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ کہتے ہیں کہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ مسجد کی چھت پر گیا۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی قمیص کے نیچے پاجامہ زیب تن فرما رکھا تھا۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسے ہٹایا پھر وضو کیا اور اپنا چہرہ اور دونوں ہاتھ دھوئے اور بازوؤں میں اوپر تک پانی بہایا۔ پاؤں کی باری آئی تو پنڈلیوں میں اوپر تک پانی پہنچایا۔ پھر فرمایا: میں نے رسول اکرم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ میری امت قیامت کے

روز اس حال میں آئے گی کہ ان کے اعضائے وضو، روشن وتابناک ہونگے۔ تو تم میں سے جو بھی اپنے تابناک اعضاء کا حصہ زیادہ کرنا چاہے کرلے۔

یہ اور اسطرح کی متعدد دیگر احادیث وآثار میں صراحتیں موجود ہیں کہ کبار صحابہ کرام اسے زیب تن فرمانے لگے تھے۔ اور مقتدر ومحترم شخصیات جب کسی لباس کو اپنالیں تو معاشرے کے عام افراد بھی اپنی قدیمی روایت اور وضع بدلنے پر مجبور ہو جایا کرتے ہیں۔ خوف طوالت سے ہم ان تمام احادیث میں سے بطور اشارہ محض اسی ایک پر اکتفا کرتے ہوئے پہلی صدی ہجری کے اختتام پر خلیفۂ وقت کے لباس کی بات کرتے ہیں۔ رسالۂ قشیریہ میں امام ابوالقاسم عبدالکریم بن ہوازن قشیری خشوع وخضوع کے باب میں لکھتے ہیں:

وحكى عن رجاء ابن حيوه انه قال: قومت ثياب عمر بن عبدالعزيز وهو يخطب باثنى عشر درهما، وكانت قباء وعمامة و قميصا و سراويل وخفين وقلنسوة. (الرسالۃ القشیریۃ، باب الخشوع والتواضع، الصفحہ ۱۸۷، دارالکتب العلمیۃ، بیروت، اردو ترجمہ از پیر محمد حسن، صفحہ ۳۲۷، ادارۂ تحقیقات اسلامی۔ اسلام آباد)

رجاء بن حیوۃ سے حکایت کی گئی ہے کہ عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لباس کی قیمت لگائی گئی، جس کو پہنے ہوئے آپ خطبہ دے رہے تھے، تو اس کی قیمت بارہ درہم لگی۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لباس میں یہ چیزیں شامل تھیں: چوغہ، پگڑی، قمیص، شلوار، چادر، دو موزے اور ایک ٹوپی۔

عرب دھیرے دھیرے اس کی طرف رغبت ومیلان کی لگامیں ڈھیلی چھوڑتے گئے اور رفتہ رفتہ یہ مقامی قدیمی لباس ازار سے بھی زیادہ پسند کیا جانے لگا۔ معززین، امراء ورؤساء اور اصحاب فضل وکمال بھی تہمد کے مقابلے میں اسی کو ترجیح دینے لگے۔ عہد اقدس تک عرب کے مقامی لباس کے مقابلے میں گو زیادہ مقبول اور مروج نہ تھا مگر عہد اقدس کے بعد کے ایام میں اس کی مقبولیت میں روز افزوں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔ ہوتے ہوتے عرب ثقافت کا اب یہ ایک لازمی جز بن گیا ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ کمال ستر پوشی کے معاملے میں ضرورت اور

شریعت دونوں کے ساتھ خاصا ہم آہنگ ہے۔

آیا آپ ﷺ نے پاجامہ زیب تن فرمایا:

آیئے! ایک اور سوال کے جواب کی جستجو کرنے کے لئے ہم عبد رسالت مآب علی صاحبہا الصلوۃ والسلام میں واپس چلتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا سروال یعنی شلوار یا پاجامے کو حضور اکرم ﷺ نے بھی کبھی زیب تن فرمایا؟

جواب علامہ شبلی نعمانی کے الفاظ ملاحظہ فرمائیں۔ آپ ﷺ کے لباس مبارک کے حوالے سے رقمطراز ہیں: ''لباس کے متعلق کسی قسم کا التزام نہ تھا عام لباس چادر قمیص اور تہمد تھی۔ پاجامہ کبھی استعمال نہیں فرمایا۔ لیکن امام احمد اور اصحاب سنن اربعہ نے روایت کی ہے کہ آپ ﷺ نے منیٰ کے بازار میں پاجامہ خریدا تھا۔ حافظ ابن قیم نے لکھا ہے کہ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ استعمال بھی فرمایا ہوگا۔'' (سیرت النبی، جلد دوم، شمائل، لباس، صفحہ ۱۲۵، دارالاشاعت۔ کراچی)

ابن قیم کے قول کا جائزہ

حافظ ابن قیم کا قیاس بوجوہ درست ہے کہ آپ کے پاجامہ خریدنے کی روایت اصحاب حدیث وارباب شمائل کی بیان کردہ نہیں۔ بلکہ اسی بزاز نے، جس سے آپ نے خریدا تھا، آپ کی تشریف آوری، شرف ملاقات اور آپ ﷺ کو پہچان لینے کے حوالے سے بات کرتے ہوئے بالتبع تشریف آوری کا سبب بھی خریداری ظاہر کیا ہے۔ پاجامے کی خریداری کا بیان ان کا مطمح نظر نہ تھا۔ روایت کے الفاظ پر غور فرمایئے:

عن سويد بن قيس قال: جلبت انا و مخرمة العبدى بزامن البحرين الى مكة، فاتانا رسول ﷺ يمشى، فساومنا بسراويل اواشترى منا سراويل و ثم وزان يزن بالاجر، فقال للوزان: ''زن وارجح'' فلما ذهب يمشى قالوا هذا رسول الله ﷺ۔ (سنن دارمی، جز ثانی، کتاب البیوع، باب الرجحان فی الوزن، صفحہ ۱۷۵، نشر السنۃ، ملتان)

ترجمہ: حضرت سوید بن قیس سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں: میں اور مخرمہ العبدی بحرین سے کچھ بزازی مکہ لیکر آئے تو رسول ﷺ چلتے ہوئے ہمارے پاس تشریف لائے۔ آپ ﷺ نے ہم سے

ایک پاجامے کے دام کئے یا (یوں کہا کہ) ہم سے پاجامہ خریدا۔ ہمارے یہاں ایک وزن کرنے والا مزدور تھا تو آپ ﷺ نے اس سے فرمایا: ''تولو اور بڑھتا ہوا تولو''۔ جب آپ ﷺ واپس چلے گئے تو سب نے کہا: آپ رسول خدا ﷺ ہیں۔

اصحاب سنن اربعہ نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے۔ امام ترمذی کی روایت میں بحرین کی جگہ ''ھجر'' کا لفظ ہے اور بلاشک راوی ''فساومنا'' کی صراحت ہے۔ مزید برآں امام ترمذی نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔ (دیکھئے: ابواب البیوع، باب ماجاء فی رجحان الوزن)

عدم صراحت عدم وقوع کی دلیل نہیں

آپ نے خریداری بھی اعلان نبوت کے بعد فرمائی۔ جس سے پتا چلتا ہے کہ ارباب سیر و احادیث اس معاملے میں مکمل خاموش ہیں کہ آپ ﷺ نے کب اور کس کس وضع کے لباس زیب تن فرمائے۔ اس میں بھی اس پاجامے کا معاملہ نمایاں ہے۔ ہم اوپر اس اصول کا سرسری ذکر کر آئے ہیں کہ سامنے کی چیز کو لفظوں میں اصالۃً بیان کیا نہیں جاتا۔ وہ صورت اور ہوتی ہے جسے آج ہم خبر نگاری کہتے ہیں۔ عہد اقدس میں ایسا کوئی دستور نہیں تھا۔ نتیجہ یہ کہ عدم بیان عدم وقوع کے اثبات کے لئے سازگار دلیل ہو نہیں سکتی۔ مزید برآں یہ تو طے ہے کہ آپ ﷺ نے پاجامہ خریدا تھا۔ آیا بغرض ضیاع خریدا تھا؟ یہ تو قیاس و گمان کی حدوں سے باہر ہے۔ تو پھر یہ بحث بالکل فضول ہوگی کہ آپ نے خود زیب تن فرمایا یا نہیں؟ اس لئے کہ آپ نے کسی اور کو پہننے کے لیے عطا فرمایا ہوگا تب بھی امر و ترغیب ہے۔ اور آپ ﷺ کے فعل پر آپ ﷺ کے قول کو مسلمہ امر ہے کہ ترجیح اور فوقیت حاصل ہے۔

اس لحاظ سے بھی پاجامہ عہد اقدس کا مسنون، مروج اور مقبول اسلامی لباس قرار پاتا ہے۔

پاجامے سے متعلق چند دیگر احکام

یہ طے کرنا ابھی باقی ہے کہ اسلامی تعلیمات کو عام کرتے اور امور شرعیہ کو بیان کرتے وقت آپ ﷺ نے آیا شلوار کے حوالے سے کبھی کوئی حکم بیان بھی فرمایا یا کلی طور پر اسے نظر انداز ہی فرمایا؟ امام احمد بن حنبل ہی کی ایک اور روایت ملاحظہ فرمائیے:

عن ابن عمر ان رجلا سأل رسول الله ﷺ ما تلبس اذا احرمنا ؟ قال: لا تلبسوا القمص ولا السراويلات ولا العمائم ولا البرانيس ولا الخفاف الا ان يكون رجلا ليست له نعلان فيلبس الخفين ويجعلهما اسفل من الكعبين ولا تلبسوا شيئا من الثياب مسه الزعفران ولا الورس۔ (مسند احمد، جلد دوم صفحہ ۱۹۵۔ بیروت۔ وصحیح مسلم، جلد اول، کتاب الحج، باب ما یباح للمحرم، صفحہ ۳۷۲، قدیمی۔ کراچی وسنن دارمی، جلد اول، باب مایلبس المحرم من الثیاب، صفحہ ۳۶۳ نشر السنۃ۔ ملتان وصحیح بخاری، کتاب اللباس، باب السراویل)

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا: احرام پہن لینے کے بعد ہم کیا کچھ پہن سکتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: قمیص، شلواریں، پگڑیاں اور ٹوپیاں مت پہنو! اور نہ موزے۔ البتہ اگر کسی کے پاس جوتے نہ ہوں تو موزے ہی پہن لے مگر ان کو ٹخنوں سے نیچا رکھے اسی طرح زعفران اور ورس (رنگ وخوشبو) لگا کپڑا بھی حالت احرام میں مت پہنو۔

امام مسلم بن الحجاج القشیری کی ایک اور روایت ملاحظہ فرمائیے:

عن ابن عباس قال سمعت رسول الله ﷺ وهو يخطب يقول: السراويل لمن لم يجد الازار والخفان لمن لم يجد النعلين يعني المحرم۔ (مسلم شریف، جلد اول، کتاب الحج، صفحہ ۳۷۳، قدیمی کتاب خانہ کراچی اور اصحاب ستہ میں سے باقی نے بھی اس حدیث کو ملتے جلتے الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے)

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے فرماتے ہیں: میں نے رسول اکرم ﷺ کو خطبہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا۔ جس محرم کو تہمد میسر نہ ہو پاجامہ پہن لے اور جسے جوتے دستیاب نہ ہوں وہ موزے ہی پہن لے۔

یہ واضح رہے کہ حالت احرام میں سلے ہوئے کپڑے پہننا ممنوع ہیں۔ صرف ازار اور چادر ہی روا اور مشروع ہیں۔ علامہ نووی نے اس لباس کی ایک حکمت یہ بھی بیان فرمائی ہے کہ:

ولیتذکر به الموت و لباس الاکفان (شرح صحیح مسلم، جلد اول، کتاب الحج، صفحہ

۲۷۲، قدیمی کتب خانہ۔ کراچی)

ترجمہ: اور اس لئے بھی کہ محرم اپنی موت اور لباس کفن کو بھی دھیان میں رکھ کر چلے۔

کیونکہ مرنے کے بعد ایسی ہی ان سلی چادروں میں لپٹ کر اسے سفر آخرت پہ نکلنا ہے۔ مزید برآں پہلی حدیث میں بیان کردہ حکم کا اطلاق اس صورت پر ہے کہ تہبد دستیاب ہو جبکہ دوسری حدیث میں تہبد کی عدم دستیابی کی صورت کا صراحت کے ساتھ ذکر ہے۔ لہٰذا کسی کا ذہن اس طرف نہ جائے کہ دونوں احادیث باہم معارض ہیں۔ ان احادیث مبارکہ سے یہ امر پوری طرح واضح ہے کہ جہاں ضرورت شرعی آپ ﷺ نے محسوس فرمائی شلوار یعنی پاجامے کا ذکر بھی فرمایا۔ اس سے متعلقہ احکام شرعیہ پر نصوص احادیث بصراحت وارد ہیں تو اسے عہد اقدس کی بھولی بسری چیز خیال کرنا ایک سنگین غلطی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ امام المحدثین محمد بن اسماعیل بخاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی ایک اور روایت ملاحظہ فرمائیں:

عن ابی هريرة قال قام رجل الى النبى ﷺ فسأله عن الصلوة فى الثوب الواحد فقال او كلكم يجد ثوبين ؟ ثم سأل رجل عمر رضى الله تعالى عنه فقال اذا وسّع الله فاوسعوا اجمع رجل عليه ثيابه صلى رجل فى ازار ورداء، فى ازار و قميص ، فى ازار و قباء، فى سراويل ورداء ، فى سراويل و قميص ، فى سراويل و قباء ، فى تبان و قباء ، فى تبان و قميص ، قال واحسبه قال فى تبان ورداء. (بخاری شریف، کتاب الصلوۃ، باب الصلوۃ فی القمیص والسراویل)

ترجمہ: حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور ایک ہی کپڑے میں نماز کی ادائیگی کا مسئلہ دریافت کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: آیا تم میں سے ہر ایک کو دو کپڑے تو مل سکتے ہیں؟ پھر ایک شخص نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ نے کشائش و فراوانی بخشی ہے تو اس کا اظہار بھی کرو۔ آدمی اپنے لیے اپنے کپڑے یکجا کرے۔ کوئی تہبد اور چادر میں نماز پڑھے، تہبد اور قمیص میں کوئی ادا کرے، کوئی تہبد اور قباء میں، پاجامے اور چادر میں، پاجامے اور قمیص میں،

پاجامے اور قباء میں، جانگیے اور قباء میں یا جانگیے اور قمیص میں نماز ادا کرے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: میرا خیال ہے کہ انہوں نے جانگیے اور چادر کا بھی ذکر فرمایا تھا۔

یہ تمام احادیث اس امر کا واضح ثبوت ہیں کہ شلوار سے متعلقہ جن شرعی امور و مسائل کی حاجت تھی، بیان کر دیئے گئے۔ لہٰذا شلوار کو ان اشیاء کی فہرست میں شامل نہیں کیا جا سکتا جن کے معاملے میں شارع علیہ السلام نے مکمل سکوت فرمایا اور امت کی صوابدید پر رہنے دیا۔ یا جن اشیاء کا عہد رسالت علی صاحبہا الصلوۃ والسلام میں وجود ہی نہ تھا یا وجود تو تھا مگر حضور رسالتمآب ﷺ کے سامنے نہ آئیں اور آئمہ مجتہدین نے رہنما اصولوں پر غور و خوض کے ذریعے ان کا شرعی حکم دریافت یا طے کیا۔

کھلے پائنچے

یہاں یہ چیز بھی قابل لحاظ ہے کہ کبھی کبھی لباس کے انداز بدل بھی جاتے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے کی ہی بات ہے بہت کھلے کھلے پائنچے زینت اور فیشن کا حصہ رہے ہیں۔ البتہ اس قسم کی تبدیلیاں جو شلوار کی ہیئت کذائیہ اور اصلی وضع کو متاثر کرتی ہیں، زیادہ دیرپا نہیں ہوتیں۔ تاہم اتنا کھلا پائنچہ کہ چلتے وقت کبھی آگے کبھی پیچھے جھول کھاتا پھرے اور پنڈلی یا جسم کے ساتھ لگا ہوا اور تابع نہ رہے یا جس پائنچے سے پہننے والے کا کھڑا پنجہ بے روک آ جا سکے گو کہ مسئلہ غیر منصوص علیہ ہے تاہم یہ ہیئت شلوار و تہبد کے بین بین نظر آتی ہے۔ اس وضع کی شلوار پہننے والے افراد کے حق میں بطور احتیاط کہا جائے گا کہ ایسا لباس پہننے سے بچیں یا پائنچے کو زمین تک نہ پہنچنے دیں۔

علامہ شامی نے فتاویٰ عتابیہ کے حوالے سے لکھا ہے:

"ويكره للرجال السراويل التى تقع على ظهر القدمين"

(فتاویٰ شامی، جلد پنجم، کتاب الحظر والاباحۃ، فصل فی اللبس، صفحہ ۲۴۷، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

ترجمہ: مردوں کے لئے ایسی شلواریں پہننا مکروہ ہیں جس کے پائنچے قدموں پر پڑتے ہوں۔

اور فتاویٰ عالمگیری میں یہی بات قدرے وضاحت سے بیان ہوئی ہے۔ ذرا مختلف الفاظ کے ساتھ عتابیہ ہی کے حوالے سے لکھا ہے:

"ويكره للرجل لبس السراويل المخرفجة وهى التى تقع على

ظهر القدمين". (فتاوی عالمگیری، جلد پنجم، کتاب الکراھیۃ، الباب التاسع فی اللبس وما یکرہ من ذلک، صفحہ ۳۳۳، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

ترجمہ: ایسی کھلی شلواریں جن کے پائنچے پاؤں کی پشت پر جا پڑتے ہوں مردوں کے لئے مکروہ ہیں۔

یہاں کھلی شلواریں پہننا مطلق مکروہ قرار دیا گیا۔ مکروہ، مرغوب و پسندیدہ کی ضد ہے۔ کبھی اس کا اطلاق حرام پر ہوتا ہے کبھی مکروہ تحریمی پر اور کبھی مکروہ تنزیہی کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ یہاں کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ پھر ایسی شلواریں پہننا مکروہ تحریمی ہوگا۔ مکروہ تحریمی حرام کے قریب تر ہوتا ہے اور من مانے طور پر کسی بھی چیز کو مکروہ تحریمی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ جب تک کہ کسی مضبوط دلیل شرعی کی تائید حاصل نہ ہو۔ ایسا مؤقف اپنا لینا حق پرستی کی کوئی شکل نہیں۔ مضبوط اور مؤثر دلیل سے مراد کم سے کم ظنی ہے۔ یہ بھی طے شدہ امر ہے کہ اس حوالے سے کسی کے پاس کوئی دلیل شرعی ہے نہیں۔ لہٰذا مکروہ تنزیہی سے زیادہ اس کی حیثیت نہیں ہو سکتی۔ اب اہل علم مکروہ تنزیہی کا حال بھی خوب جانتے ہیں۔

تہمد

عہد رسالت علی صاحبہا الصلوۃ والسلام میں شلوار کے مقابل تہمد (تہبند) پہننے کا رواج بھی تھا۔ بلکہ شلوار کے مقابلے میں یہ زیادہ عام تھا۔ یہ عربوں کا اپنا قدیمی لباس تھا اور "ازار" کے نام سے موسوم تھا۔ آپ ﷺ کا عام معمول اسی کو زیب تن فرمانا تھا۔ جب آپ ﷺ نے وصال فرمایا تو اس وقت آپ نے اسی کو زینت بخش رکھی تھی۔ صحیحین کی روایت ہے:

عن ابی بردۃ اخرجت الینا عائشۃ کساء ملبّدا و ازارا غلیظاً فقالت قبض روح رسول اللہ ﷺ فی ھذین (بحوالہ مشکوۃ شریف، جلد دوم، کتاب اللباس، حدیث ثالث)

ترجمہ: حضرت ابو بردہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ہمیں ایک پیوند دار کپڑا اور ایک موٹا تہمد نکال کر دکھایا اور فرمایا: رسول اکرم ﷺ نے ان دو کپڑوں میں وصال فرمایا تھا۔

ازار یا تہمد کا معاملہ پاجامے یا شلوار سے خاصا مختلف تھا۔ یہ چونکہ عربوں کا اپنا اور قدیم وضع کے لباس کا حصہ تھا، اس لئے مقامی تہذیبی و ثقافتی اقدار میں گندھا ہوا اور کیوں کے لیے کئی یادوں کا امین اور محافظ بھی تھا۔ جب معاشرے میں کسی روایت کی جڑیں اس قدر گہری ہوں تو عقلی تخیلی استدلال کی حاجت ہی رہتی ہے نہ کسی مدد، تائید یا کسی حمایت کی ضرورت ہی پڑتی ہے۔ ایسی روایت آپ ہی آپ اپنی بقاء کا ساماں کر لیتی ہے۔ ایسی جمی جمائی ہوئی روایت سے مقابلہ تھا شلوار کا۔

جاہلی رجحانات

تہمد کے بارے میں عہد جاہلیت میں ہی دو طرح کے رجحانات جنم لے چکے تھے۔ خوشحالی اور فارغ البالی نے عرب نوجوانوں کو جب عیش و عشرت اور زیبائش و نمائش کی طرف راغب کیا تو منچلے البیلے اسے لے اڑے۔ عربوں کے تجارتی قافلے نہایت قیمتی اور نفیس قسم کی ریشمی چادریں اپنے ساتھ لاتے تھے۔ یمن کی چادریں تو عہد رسالت میں بھی خاصی مقبول رہی ہیں۔ چنانچہ نہایت عمدہ اور نفیس چادریں بطور تہمد استعمال کرتے اور غرور و نخوت اور شان بے نیازی کے اظہار کے لئے لمبے لمبے لڑ پیچھے گھسٹنے کے لیئے چھوڑ دیتے۔ ایسے کچھ مناظر و مظاہر آج بھی پاکستان کے کچھ دیہی علاقوں میں لاچے کی شکل میں دیکھنے کو مل سکتے ہیں۔ بلکہ بعض لوک فنکار اپنے فن کے مظاہرے کے دوران کبھی کبھار تو بالکل اسی ڈھب اور وضع قطع کا مظاہرہ کرتے ہیں جو پندرہ صدی پہلے کے عرب نوجوانوں کا مشغلہ رہا ہے۔ گویا،

آغاز جوانی ہے ذرا جھوم کے چلتے ہیں
دنیا یہ سمجھتی ہے ہم پی کے چلتے ہیں

عمرو بن قمیئہ کے اشعار

عرب شاعروں نے بھی اپنے کلام میں اس انداز تفاخر کو اہمیت اور جگہ دی ہے۔ عہد جاہلیت کے قدیم شعراء میں سے عمرو بن قمیئہ کے اشعار میں اس رجحان کو ملاحظہ کیجئے:

یا لھف نفسی علی الشباب ولم
افقد بہ اذ فقدتہ احدا

اذا اصبحت السريط والمروط السی

ادنی تحاری وانقض اللمما

لا تغبط المرء ان یقال لہ

امسی فلان لسنہ حکما

ان سرہ طول عمرہ فلقد

اضحیٰ علیٰ الوجہ طول ما سلما

(دیوان الحماسۃ، باب الادب، صفحہ ۳۰۲، المکتبۃ السلفیہ، لاہور)

ترجمہ:

جوانی پر ہائے مجھے دلی افسوس ہے۔ اور بات یہ ہے کہ جب میں نے اسے کھویا تو کوئی معمولی چیز نہیں کھوئی۔

جب میں نے قیمتی یمنی چادریں ریٹا اور مروط گھسیٹتا ہوا قریبی مے فروش کی طرف جاتا تھا اور رہ رہ کر اپنی زلفوں کو چہرے سے پرے جھٹکتا تھا۔

کسی پر اس وجہ سے رشک مت کیا کرو کہ اس کے بارے کہا جانے لگے: فلاں آدمی عمر میں بڑا ہونے کی وجہ سے سردار ہو گیا ہے۔

اگر درازی عمر نے اس کو شادمان کر دیا ہے تو اس کے چہرے پر بڑھاپے کے آثار بھی تو نمایاں ہو گئے ہیں۔

سنت رسول ﷺ

خود تہمد ایک لباس ہے۔ اور اپنی جگہ نہایت عمدہ اور نفیس لباس ہے۔ خصوصاً جب کہ حضور رسالت مآب ﷺ نے خود بھی اسے زیب تن فرمایا اور وصال مبارک تک یہی آپ ﷺ کا پسندیدہ لباس رہا۔ تو سنت رسول ﷺ ہونے کے ناطے بھی اس کی فضیلت اور برکت میں کلام کی گنجائش نہیں رہتی۔ مگر اسی قدر احتیاطیں اور نزاکتیں بھی بڑی ہیں۔ کئی دیگر چیزوں کی طرح جن کا مقاصد کے خلاف استعمال جرم اور ظلم کے زمرے میں آتا ہے۔ اس کا بھی مقاصد سے ماوراء استعمال شریعت اسلامی میں ناروا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عہد جاہلیت میں ہی بعض سلیم الطبع لوگ ان

حرکات سے بیزاری و ناراضی کا برملا اظہار کرتے رہے ہیں۔

دوسرا رجحان

اس کا عین مخالف رجحان جسے حضور اکرم ﷺ نے بھی پسند فرمایا اور اسلامی تعلیمات میں خصوصی مقام اور اہمیت دی، زمانہ قبل از اسلام میں بھی موجود تھا۔ باشعور و عملیت پسند حلقے اس کو پسند کرتے، اپناتے اور سراہتے تھے۔ حضور سرکار دو عالم ﷺ نے ماضی کی بعض روایات کو وہی کی حالت میں یا ترمیم و اصلاح کے بعد قبول فرمایا اور شریعت اسلامی کا جزء بنایا ہے۔ معروف اصولی محمد زکریا بردیسی لکھتے ہیں:

الاترى ان الشارع الحكيم حين اشرق نور الاسلام راعى الصحيح من عرف العرب فى التشريع فاقر الكثير من الامور التى تعارفها العرب قبل الاسلام بعد ان هذبها و ادخل عليها بعض الاصلاحات۔ (اصول الفقہ، الدلیل السابع العرف، صفحہ ۳۳۶، دار الثقافۃ للنشر۔ القاہرۃ)

ترجمہ: کبھی آپ نے غور نہیں فرمایا؟ کہ علیم و حکیم شارع نے جب نور اسلام کو عام کیا تو عربوں کے طور طریقوں میں سے جو بھی درست تھے انہیں شریعت اسلامی میں جگہ دی ہے۔ ایسی بہت سی چیزیں ہیں جو اسلام سے قبل عربوں کے معمولات میں داخل تھیں اور آپ ﷺ نے تہذیب و اصلاح کے بعد انہیں برقرار رکھا۔

انہی طور طریقوں میں سے ایک ہمارا موضوع بحث رجحان بھی ہے۔ اس رجحان کا تاثر ہمیں ہوبکر بن ہوازن کے سردار درید بن صمہ کے اشعار سے ملتا ہے۔ درید کو زمانہ اسلام بھی ملا مگر ایمان سے محروم رہا۔ بہت بوڑھا ہو چکا تھا جب اس نے مسلمانوں کے خلاف جنگ حنین میں شرکت کی اور شکست کھانے کے بعد اپنی جمعیت لے کر اوطاس کے مقام پر مسلمانوں کے خلاف دوبارہ نبرد آزما ہوا۔ اب کے بار حضرت ربیعہ بن رفیع کے ہاتھوں مارا گیا۔ (دیکھئے: عامۃ کتب تواریخ و سیرت النبی، علامہ شبلی نعمانی، جلد اول، غزوۂ حنین و اوطاس، صفحہ ۳۱۱، دار الاشاعت۔ کراچی ۱۹۸۵ء)

ذیل میں ہم اس کے کلام میں سے چند منتخب اشعار نقل کرتے ہیں۔ کہتا ہے:

فحئت الیہ والرماح تنوشہ
کوقع الصیاصی فی النسیج الممدد

وکنت کذات البو ریعت فاقبلت
الی جلد من مسك سقب مقدد

فان یك عبداللہ خلی مکانہ
فما کان وقافا ولا طائش الید

کمیش الازار خارج نصف ساقہ
بعید من الافات طلاع النجد

قلیل التشکی للمصیبات حافظ
من الیوم اعقاب الاحادیث فی غد

(دیوان الحماسۃ، باب المراثی، صفحہ ۲۱۲، المکتبۃ السلفیہ، لاہور)

ترجمہ:

تو جب میں اس کے پاس پہنچا تو نیزے اس کے جسم میں یوں پیوست ہو رہے تھے جیسے بنے ہوئے تیار تھان میں جولاہے کا کانٹا اترتا ہے۔

اور میری حالت بھس بھرے بچے والی اس بے تاب اونٹنی کے جیسی تھی جو پہلے تو خوف کھاتی ہے پھر اپنے لخت لخت بچے کے چمڑے سے ہی دل لگا لیتی ہے۔

تو کیا ہوا جو عبداللہ نے دنیا چھوڑ دی، وہ بزدلی کے باعث دبکا رہنے والا تو نہیں تھا اور نہ ہی اس کے وار خالی جایا کرتے تھے۔

اپنا تہمد اتنا چھوٹا رکھتا کہ آدھی پنڈلی باہر رہ جاتی، آفتوں سے دور رہتا اور پہاڑی بکرے کی طرح سنگلاخ چوٹیوں پہ کدکڑے مارتا پھرتا تھا۔

مصیبتوں کی شکایت بہت کم کرتا تھا اور آئندہ ہونے والی باتوں کے انجام کو آج ہی سے خیال میں رکھتا تھا۔

عملیت پسند حلقے فقط سراہتے ہی نہیں تھے اسے اپناتے بھی تھے اور سرگرمی اور فعالیت کا نمونہ خیال کرتے تھے۔ جس سے ناز و نعم کے پروردہ دور اور محروم ہی رہتے ہیں۔ اسلام نے بھی ایمان و عمل دونوں کو ناگزیر قرار دیا ہے۔ اور دونوں کی صحت اور سمت کی درستگی کے ضابطے بھی مقرر فرمائے اور طے کر دیے ہیں۔ مقصود مسلمانوں کو مقصدیت کی تعلیم دینا اور عملیت پسندی کی افادیت جتا کر ہمت و حوصلہ پیدا کرنا اور استقامت و سربلندی سے ہمکنار کرنا تھا۔ کسی روز اگر اس دین کے پیروکار، محض ترجمۃ الباب کی مناسبتیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر خوش ہو جانے سے بہت آگے، اولہ شرعیہ کا داخلی ربط استوار اور دریافت کرنے میں کامیاب ہو گئے تو نشاۃ ثانیہ کی حقیقی بنیاد میسر آ سکے گی۔ چنانچہ ممانعت اسبال کے سرے مندرجہ ذیل حدیث مبارک اور اس طرح کے دیگر ضابطوں میں گندھی ہوئی حکمتوں اور مصلحتوں سے جڑے ہوئے ہیں:

عن ابن ابی لیلی قال کان حذیفۃ با لمدائن فاستقی فاتاہ دھقان بماء فی اناء من فضۃ فرماہ بہ وقال انی لم ارمہ الا انی نھیتہ فلم ینتہ۔ قال رسول اللہ ﷺ: الذھب والفضہ والحریر و الدیباج ھی لھم فی الدنیا ولکم فی الاخرۃ۔ (صحیح بخاری، کتاب اللباس، باب لبس الحریر و افتراشہ للرجال)

ترجمہ: حضرت ابن ابی لیلی سے روایت ہے فرماتے ہیں: حضرت حذیفہ بن الیمان مدائن کے مقام پر تھے۔ آپ رضی اللہ تعالی عنہ نے پانی مانگا تو ایک کسان نے چاندی کے کٹورے میں پانی لا کر آپ کو پیش کیا۔ آپ رضی اللہ تعالی عنہ نے وہ کٹورہ اسی کو دے مارا۔ اور فرمایا: میں نے اس لیے اس کو مارا ہے کہ میں نے اسے اس حرکت سے روکا بھی تھا مگر باز نہیں آیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: سونا و چاندی اور ریشم و دیباج دنیا میں غیر مسلموں کے لئے ہیں۔ آخرت میں تمہارے لئے ہیں۔

حکم کا تعلق تہمد سے ہے

حضور اکرم ﷺ نے بھی بصراحت تمام تہمد ہی کو ٹخنوں سے نیچا رکھنے کی ممانعت فرمائی ہے۔ جہاں جہاں یہ حکم بیان ہوا بصراحت تمام تہمد ہی کا ذکر کیا گیا۔ شلوار کا ذکر اس حوالے سے کہیں نہیں ملتا۔ چند احادیث ملاحظہ کیجئے۔

عن ابی ذر رضی اللہ عنہ عن النبی ﷺ انہ قال: لا یکلمھم اللہ ولا ینظر الیھم یوم القیمۃ ولا یزکیھم ولھم عذاب الیم۔ قلت: من ھم یارسول اللہ ﷺ؟ فقد خابوا و خسروا۔ فاعادھا ثلاثا۔ قلت من ھم یارسول اللہ ﷺ؟ خابوا و خسروا۔ قال المسبل والمنان (و)المنفق سلعتہ بالحلف الکاذب او الفاجر۔ (سنن ابی داؤد، کتاب اللباس، باب ماجاء فی اسبال الازار)

ترجمہ: حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی اکرم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ ان سے کلام نہیں فرمائے گا، نہ قیامت کے روز ان پر نظر کرم فرمائے گا نہ انہیں پاکیزگی دے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ کون ہیں وہ لوگ؟ وہ تو مارے گئے اور خسارے میں رہے۔ آپ ﷺ نے تین بار یہی دہرایا اور میں بھی یہی کہتا رہا: اے اللہ کے رسول ﷺ وہ تو مارے گئے اور خسارے میں رہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا تہمد گھسیٹنے والا، احسان جتانے والا اور جھوٹی قسمیں کھا کھا کر اپنا سودا بیچنے والا۔

امام مسلم بن حجاج قشیری نے یہی حدیث مندرجہ ذیل الفاظ میں روایت فرمائی ہے:

عن ابی ذر عن النبی ﷺ قال: ثلاثۃ لا یکلمھم اللہ یوم القیمۃ المنان الذی لا یعطی شیئا الا منہ والمنفق سلعتہ بالحلف الفاجر و المسبل ازراہ۔ (صحیح مسلم، جلد اول، کتاب الایمان، باب غلظ تحریم اسبال الازار، صفحہ ۷۱، قدیمی کتاب خانہ۔ کراچی)

ترجمہ: حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی اکرم ﷺ سے روایت فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے

فرمایا: قیامت کے روز اللہ تعالیٰ تین آدمیوں سے کلام نہیں فرمائے گا۔ وہ آدمی جو کسی کو کچھ دیتا ہے تو احسان جتائے بغیر نہیں رہتا۔ اور وہ جو جھوٹی قسمیں کھا کھا کر اپنا مال بیچتا ہے اور وہ آدمی جو اپنا تہمد گھسیٹتا پھرتا ہے۔

عن العلاء بن عبدالرحمن عن ابیہ قال سألت ابا سعید الخدری عن الازار، فقال: علی الخبیر سکت، قال رسول اللہ ﷺ: ازرۃ المسلم الی نصف الساق و لا حرج اولا جناح فیما بینہ وبین الکعبین وما کان اسفل من الکعبین فھو من النار، من جر ازارہ بطرا لم ینظر اللہ الیہ۔ (ابوداؤد، کتاب اللباس، باب فی قدر موضع الازار)

ترجمہ: حضرت علاء بن عبدالرحمن اپنے والد سے روایت کرتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا: میں نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے تہمد کے معاملے میں دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا: اچھے باخبر شخص کے پاس سوال لیکر آئے ہو۔ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ: مسلمان کا تہمد آدھی پنڈلی تک ہے اور اس کے اور ٹخنوں کے مابین ہو تو بھی قابل مواخذہ نہیں اور جو ٹخنوں سے نیچے ہے وہ آگ ہے۔ جس نے غرور کے باعث اپنا تہمد گھسیٹا اللہ تعالیٰ اس پر نظر کرم نہیں فرمائے گا۔

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال بینما رجل یصلی مسبلا ازارہ فقال لہ رسول اللہ ﷺ اذھب فتوضأ فذھب فتوضأ ثم جاء فقال اذھب فتوضأ فقال لہ رجل یا رسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم مالک ؟ امرتہ ان یتوضأ ثم سکت عنہ قال انہ کان یصلی وھو مسبل ازراہ فان اللہ تعالیٰ لا یقبل صلوۃ رجل مسبل۔ (سنن ابی داؤد، کتاب اللباس، باب ماجاء فی اسبال الازار)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ہمارے سامنے ایک آدمی اپنے تہمد کو زمین تک لٹکائے نماز پڑھ رہا تھا۔ رسول اکرم ﷺ نے اسے حکم دیا: جاؤ اور وضو کرو۔ وہ جب واپس آیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: جاؤ اور وضو کرو۔ ایک آدمی نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ معاملہ کیا ہے؟ آپ ﷺ نے اس کو حکم دیا کہ جائے اور وضو کرے، پھر آپ نے خاموشی اختیار فرمائی۔ آپ

ﷺ نے فرمایا: وہ اس حالت میں نماز پڑھ رہا تھا کہ اس کا تہمد زمین تک لٹکا ہوا تھا۔ اور اللہ تعالیٰ اس شخص کی نماز قبول ہی نہیں فرماتا جو تہمد لٹکائے ہوئے ہو۔

اسبال کے مواقع

اب یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ اسبال کہاں کہاں ہوتا ہے یا ہوسکتا ہے؟ فرمان رسالت مآب ﷺ ہے: عن سالم بن عبدالله رضی الله عنهما عن ابیه عن النبی ﷺ قال: الاسبال فی الازار و القمیص والعمامة ومن جر منها شیئاً خیلاء لم ینظر الله الیه یوم القیمة. (سنن ابی داؤد، کتاب اللباس، باب فی قدر موضع الازار)

ترجمہ: حضرت سالم بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے والد ماجد سے اور وہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اسبال تہمد، قمیص اور عمامے میں ہوتا ہے۔ اور جو کوئی ان میں سے کوئی بھی چیز از راہِ تکبر گھسیٹتا پھرے گا، قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اس پر نظر کرم ہی نہ فرمائے گا۔

اس حدیث پاک میں حضور اکرم ﷺ نے واضح لفظوں میں یہ تعین بھی فرمادیا ہے کہ اسبال کہاں کہاں ہوتا ہے یا ہوسکتا ہے۔ آپ ﷺ نے بالترتیب تہمد، قمیص اور عمامے کا ذکر فرمایا ہے۔ اس میں ایک اشارہ یہ بھی ہے کہ سب سے زیادہ امکان تہمد میں ہے۔ قمیص میں اس سے کم اور عمامے میں یہ امکان اور کم ہے۔ یہ پہلو غور طلب ہے کہ شارع علیہ السلام نے مواضع اسبال کا تعین بھی خود فرمادیا۔ اور شلوار یا پاجامے کا ذکر نہیں فرمایا۔ آپ ﷺ کا یہ سکوت معرض بیان میں ہے۔ مسلمہ امر اور قاعدہ کلیہ ہے: لا ینسب الی ساکت قول لکن السکوت فی معرض الحاجة بیان. (مجلۃ الاحکام العدلیہ، مادہ: ۶۷)

ترجمہ: کسی خاموش کی طرف کوئی قول تو منسوب نہیں کیا جاسکتا البتہ جہاں ضرورت ہو، خاموشی بھی بیان شمار ہوگی۔

معرض بیان میں شارع علیہ السلام کی خاموشی کے حوالے سے فخر الاسلام علامہ بزدوی فرماتے ہیں: السکوت من صاحب الشرع ﷺ عند امر یعاینه عن

التغییر یدل علی الحقیقة علیه و یدل فی موضع الحاجة الی البیان علی البیان. (کنز الوصول الی معرفۃ الاصول معروف بہ اصول بزدوی، باب بیان الضرورۃ، صفحہ ۲۱۷، میر محمد کتب خانہ۔ کراچی)

ترجمہ: کسی امر کو ملاحظہ فرما کر بھی تبدیلی کا حکم دینے کی بجائے آپ ﷺ کی خاموشی کا مطلب یہ ہے کہ وہی حقیقت ہے۔ اور جہاں بولنے کی ضرورت ہو، خاموشی بھی بیان ہوتی ہے۔

فخر الاسلام علامہ بزدوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ہی ایک اور جگہ قرآن مجید کی آیت مبارکہ "یا یها الذین امنوا لا تسئلو عن اشیاء ان تبدلکم تسؤکم (سورہ المائدہ، آیت ۱۰۱) اے ایمان والو! مت پوچھا کرو ایسی باتیں کہ اگر تم پر ظاہر کردی جائیں تو تمہیں بری لگیں" کے ذیل میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول نقل کیا ہے:

ابهموا ما ابهم الله واتبعوا ما بین الله

(اصول بزدوی، باب وجوہ الوقوف علی احکام الحکم، صفحہ ۱۳۳، میر محمد کتب خانہ۔ کراچی)

ترجمہ: جسے اللہ نے مبہم چھوڑ دیا اسے مت کریدو اور جسے بیان کردیا ہے اس کی اتباع کرتے رہو۔

جبکہ پیر کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے بھی محولہ بالا آیت مبارکہ کی تفسیر فرماتے ہوئے ایک قدرے طویل حدیث نقل فرمائی ہے، جس کے آخری کلمات یہ ہیں: وسکت عن اشیاء من غیر نسیان فلا تبحثوا عنها. (ضیاء القرآن، تفسیر آیت محولہ بالا)

ترجمہ: شارع نے بعض چیزوں کے معاملے میں بھولے بغیر خاموشی اختیار فرمائی ہے تو تم انہیں مت کریدو!

اب حدیث "مواقع اسبال" کے مضمون پر ایک مرتبہ پھر غور فرمایئے۔ پاجامے یا شلوار کے لئے عین معرض بیان ہے۔ قمیص اور عمامے تک کا تو آپ ﷺ نے ذکر فرمادیا مگر شلوار یا پاجامے کو چھوڑ دیا۔

اب ان میں کمی بیشی کی کسی اور میں ہمت و مجال نہیں ہونی چاہیے۔ ورنہ یہ شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مقابلے میں (عیاذاً باللہ) جرأت ہوگی۔ یا تو کوئی صاحب ایمان یہ کہنے کی

ناپاک جسارت کرے کہ ان تین اشیاء کا ذکر فرماتے وقت آپ کو پاجامہ یعنی شلوار، جو باقی ہر ہر جگہ یاد رہا، یاد نہیں رہا تھا۔ اور ہمیں چونکہ یاد رہا اس لئے پائچے اونچا رکھنے کا حکم ہم نے اپنی طرف سے شریعت میں داخل کرتے ہوئے شریعت کا ادھورا پن دور کیا۔ ورنہ یہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں رہے گا کہ یہ ایک سنگین غلطی ہے۔ شریعت کی آڑ میں جبری مشقت ہے۔ اور بھولے بھالے لوگوں کو ان کی کم علمی کی سزا کے طور پر جبراً جہنمی اور گناہگار بنایا جارہا ہے۔ (باقی آئندہ)

اعجاز ہے کسی کا یا گردش زمانہ!
ٹوٹا ہے ایشیا میں سحر فرنگیانہ!
تعمیر آشیاں سے میں نے یہ راز پایا
اہل نوا کے حق میں بجلی ہے آشیانہ!
یہ بندگی خدائی، یہ بندگی گدائی
یا بندۂ خدا بن، یا بندۂ زمانہ
غافل نہ ہو خودی سے کر اپنی پاسبانی
شاید کسی حرم کا تو بھی ہے آستانہ!
اے لاالہ کے وارث باقی نہیں ہے تجھ میں
گفتار دلبرانہ، کردار قاہرانہ
تیری نگاہ سے دل سینوں میں کانپتے تھے!
کھو گیا ہے تیرا جذب قلندرانہ!
راز حرم سے شاید اقبال باخبر ہے
ہیں اس کی گفتگو کے انداز محرمانہ!

روح اجتماع اور جذبۂ تعاون

علامہ شاہ محمد جعفر ندوی پھلواری

سبق آموز تمثیلی حکایت

بچوں کی کتاب میں یہ حکایت آپ نے پڑھی ہوگی کہ: کسی گاؤں میں آگ لگ گئی۔ لوگوں نے اسے بجھانے کی بڑی کوشش کی لیکن آگ بڑھتی ہی گئی۔ آخر سب کو اسی میں خیر نظر آئی کہ بستی چھوڑ کر جلد سے جلد بھاگ جائیں۔ پہلے عورتوں اور بچوں کو روانہ کیا پھر جو ضروری اثاثہ اس عجلت میں لے جاسکتے تھے لے گئے۔ اس افراتفری میں دو شخص رہ گئے۔ ایک نابینا تھا اور دوسرا لنجا۔ نابینا راستہ نہیں دیکھ سکتا تھا اور لنجا چل نہیں سکتا تھا۔ ایک آنکھوں سے معذور تھا اور دوسرا پیروں سے۔ ساری بستی اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ گئی۔ لیکن یہ دونوں معذور و مجبور فریاد کرتے رہ گئے۔ جب اپنی جان خطرہ میں ہو تو دوسروں کو بچانے کی فکر کون کرتا ہے؟ آگ برابر بڑھتی جارہی تھی اور قریب تھا کہ دونوں معذور بھی اس کی لپیٹ میں آجائیں۔ یکا یک نابینا کو ایک ترکیب سوجھی وہ ٹٹولتا ہوا لنجے کے پاس آیا اور اس سے کہا کہ تم میری پیٹھ پر سوار ہو جاؤ۔ نابینا بیٹھ گیا اور لنجے کو سہارا دے کر اپنے کاندھوں پر سوار کرلیا اور لنجا کے سہارے کھڑا ہوگیا اور لنجے سے کہا کہ اب تم رستہ بتاتے جاؤ اس طرح دونوں صحیح سلامت بستی سے باہر آگئے اور آگ کی لپٹ سے محفوظ ہو گئے۔ رومی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے کیا مزے کی بات کہی ہے۔

اے برادر قصہ چوں پیمانہ ایست — معنی اندر وے مثال دانہ ایست

روح اجتماع کی اس سے بہتر مثال شاید ہی کوئی اور مل سکے۔ اس چھوٹے سے قصے میں اجتماعیت کے بے شمار پہلو سمٹ کر آ گئے ہیں۔ نابینا اور لنجا الگ الگ شخصیت ہونے کی صورت میں جان کے خطرے سے دوچار تھے لیکن جب لنجا نابینا کے کاندھوں پر سوار ہو گیا اور دونوں ایک شخصیت بن گئے تو دونوں کی جداگانہ صلاحیتیں ایک دوسرے کے کام آ گئیں۔ لنجا چل نہیں سکتا تھا مگر دیکھ سکتا تھا نابینا دیکھ نہیں سکتا تھا لیکن چل سکتا تھا۔ جب لنجا نابینا کے کاندھوں پر سوار ہو گیا اور دونوں ایک وحدت میں تبدیل ہو گئے تو لنجا نابینا کی آنکھیں بن کر رستہ دیکھنے لگا اور نابینا لنجے کے پاؤں بن کر محفوظ راستے پر چلنے لگا۔ نابینا کی چلنے کی صلاحیت لنجے کی آنکھوں کے بغیر بے کار تھی اور لنجے کی بینائی نابینا کے پیروں کے بغیر بے مصرف علیحدہ علیحدہ دونوں صلاحیتیں بے نتیجہ تھیں لیکن جب دونوں متحد ہو گئے تو قدرتی طور پر دونوں کی جداگانہ صلاحیتیں ایکدوسرے کے کام آ گئیں۔ الگ الگ رہنے کی صورت میں کسی کی جان نہ بچ سکتی تھی۔ لیکن باہم مل کر دونوں نے اپنی جانیں بچالیں۔ یہ ہے اجتماعیت کی ایک عمدہ تمثیل۔

اگر ہم اپنی پوری قوم کو اسی عینک سے دیکھیں تو صاف نظر آ جائے گا اس کی بقا اجتماعیت کی روح کو اپنانے میں اور بربادی انفرادیت میں ہے۔ وہ کونسی بڑی سے بڑی صلاحیت ہے جو ہماری قوم کے افراد میں موجود نہیں؟ لیکن جو کچھ اب تک ہوتا رہا وہ ہم آپ دیکھتے رہے ہیں۔ اعلیٰ سے اعلیٰ دماغ رکھنے والے لیڈروں کی ساری توانائیاں تعمیر کی بجائے تخریب میں صرف ہوتی رہیں۔ ہر صاحب فکر نے اپنی قوتیں صرف اپنے آپ کو بنانے اور دوسروں کو بگاڑنے میں صرف کیں۔ اگر ان کے دماغ اور ان کی توانائیاں اجتماعیت کی روح سے کچھ بھی آشنا ہوتیں اور متحد ہو کر کام کرتیں تو ہمارے قومی و ملکی مسائل کب کے حل ہو چکے ہوتے لیکن فرقی تعصبات اور جماعتی اختلافات تمام انفرادی صلاحیتوں اور توانائیوں کو ضائع کرتے رہے۔ ہر ایک کی نظر میں قومی خدمت سے مقصود صرف اپنی خدمت تھی۔ فرخ دلی کی جگہ تنگ نظری کام کر رہی تھی۔ رواداری کی بجائے تعصب کارفرما تھا۔ نہ اپنی صلاحیتوں سے دوسروں کو نفع پہنچایا، نہ دوسروں کی توانائیوں سے خود فائدہ اٹھایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سبھی کو ایک آگ کی لپیٹ میں آنا پڑا۔

قرآن نے اجتماعی وابستگی پر بار بار زور دیا ہے اور تفریق اجتماع سے بار بار روکا ہے۔

ایک جگہ تو بہت واضح لفظوں میں ایجابی و سلبی دونوں پہلوؤں کو یوں بیان فرمایا کہ:

واعتصموا بحبل الله جميعا ولا تفرقوا۔

اللہ کی رسی کو اجتماعی روح کے ساتھ مضبوطی سے پکڑ لو اور تفرقہ نہ پیدا کرو۔

اجتماعیت کی ایک مثال

یہاں جمیعاً کے معنی ''تم سب کے سب'' نہیں۔ اس کے لیے عربی میں عموماً اجمعین کا لفظ آتا ہے۔ یہاں جمیعاً سے مقصد اجتماعی اسپرٹ کے ساتھ اللہ کی رسی سے چمٹ جانا۔ اجتماعی اسپرٹ کی مثال یوں سمجھیے کہ اگر ایک گھڑی کے تمام پرزوں کو اکٹھا کر کے ایک رومال میں باندھ لیجئے اور کلاک میں رکھ دیجئے تو گھڑی نہیں چلے گی۔ گھڑی اسی وقت چلے گی جب اس کے تمام پرزے ایک مربوط اور منظم شکل میں باہم پیوستہ ہوں اور ان کے اندر اس نظم و ضبط کے ساتھ ایسی ہم آہنگی ہو کہ ہر پرزہ ایک ہی مقصد کے لیے حرکت کر رہا ہو۔ بظاہر کوئی پرزہ جانب راست سے جانب چپ گردش کر رہا ہوگا اور کوئی بائیں سے دائیں گھوم رہا ہوگا اور کوئی دونوں سمتوں میں حرکت کر رہا ہوگا۔ اور کوئی بالکل ساکن بھی ہوگا لیکن سب کا مقصد ایک ہی ہے اور وہ صحیح رفتار اور ٹھیک وقت بتانا۔ نظم و ضبط اور ہم آہنگی کی یہی روح ہے جسے لفظ جمیعاً سے تعبیر کیا گیا ہے لیکن بھیڑ کو یک جا کرنا مقصود نہیں کیونکہ پرزوں کی بے ربط یکجائی سے گھڑی نہیں چلتی۔

ہمارے معاشرے کی اعلیٰ صلاحیتیں

اس وقت ہمارے اندر اگرچہ ایسے افراد نہیں جو تمام صلاحیتوں تنہا مالک ہوں لیکن جداگانہ طور پر اعلیٰ سے اعلیٰ صلاحیت کے مالک موجود ہیں۔ علوم، فنون، افکار، تنظیم، امامت (لیڈرشپ)، دیانت، امانت، اخلاق، تقویٰ، سیاست وغیرہ کی وہ کونسی صلاحیت ہے جو آج ہمارے مختلف افراد میں موجود نہیں؟ لیکن ہوتا یہ رہا ہے کہ جس کے پاس جو صلاحیت ہوئی وہ اسی کو کل سمجھ کر بیٹھ گیا اور اسی بنیاد پر اپنی ایک جداگانہ پارٹی بنا کر دوسری صلاحیتیں رکھنے والوں سے بے نیاز ہو گیا۔ نہ فقط بے نیاز ہو گیا بلکہ ان صلاحیتوں کو اپنی پارٹی میں کوئی مقام ہی نہ حاصل کرنے دیا۔ بلکہ اس سے آگے ان صلاحیتوں کی ضرورت و اہمیت سے بھی منکر ہو گیا۔ اگر کسی میں بڑی اچھی تنظیمی صلاحیت ہوئی تو اس نے اس صلاحیت کی اساس پر ایک فرقہ بنالیا۔ اور سمجھ بیٹھا کہ

اگر عسکری تنظیم حاصل ہوگئی تو سب کچھ حاصل ہوگیا۔ اب نہ علوم وفنون کی ضرورت ہے نہ سیاست میں کسی کی امامت تسلیم کرنے کی حاجت۔ یہی حال اہل علم کا ہوا۔ انہوں نے فقہی مسائل کا کچھ مطالعہ کرلیا تو اس ہلدی کی ایک گانٹھ کو لے کر روایتی چوہیا کی طرح عطار کی دکان کھول لی اور ہر فن میں اپنی بے شرکت غیرے امامت وامارت کا سکہ بٹھانا شروع کردیا۔ اگر کوئی سیاست کے میدان میں حسن اتفاق سے کامیاب ہوگیا تو پارٹی لیڈرشپ کی الگ دنیا بسالی اور یہ سمجھ بیٹھا کہ اسی کامیابی میں دنیا وآخرت کی ساری نعمتیں سمٹ کر آگئیں۔ اور اس سے آگے کوئی چیز نہیں۔ یہی حال ''اہل روحانیت'' کا بھی ہوا کہ انہوں نے بعض اقدار کی محافظت کے نام سے ایک الگ خانقاہ کھول لی اور اپنے حلقے کو لے کر دنیاداری کے کاموں سے انقطاع کرلیا اور یہ سمجھ لیا کہ ترک دنیا کر کے آخرت حاصل کرلی جائے گی۔ وہ یہ نہ سمجھے کہ:

یہ حکمت ملکوتی یہ علم لاہوتی
حرم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
یہ ذکر نیم شبی، یہ مراقبے، یہ سجود
تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں
زباں نے کہہ بھی دیا لاالٰہ تو کیا حاصل
دل ونگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

ہم یہ نہیں کہتے کہ ان حلقوں کے سربراہوں کے اندر مخصوص صلاحیتیں نہیں۔ وہ بڑی اعلیٰ صلاحیتیں رکھتے ہیں لیکن وہ بہرحال جزئی ہیں، ایسی کلی نہیں جو دوسری صلاحیتوں سے بے نیاز کردیں۔ معاشرے کی تعمیر کے لیے صرف ایک یا چند ہی صلاحیتیں درکار نہیں۔ بہت سی صلاحیتیں مطلوب ہیں۔ اگر وہ سب ایک وحدت کی شکل میں بروئے کار آئیں تو ایک اور ایک ملکر یقیناً گیارہ ہوجائیں گے۔

انفرادیت کے اسباب

انقطاعی یا انفرادی طرز زندگی کے جو اسباب ہوتے ہیں وہ عموماً یہ ہیں:

۱۔ احساس شکست خوردگی۔۔۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب اپنے اندر انسان قوت مقابلہ نہیں

پاتا۔۔ خواہ مادی طاقت سے ہو یا علمی طاقت سے۔۔۔ تو اپنی ٹولی الگ بنالیتا ہے۔ اس میں فراریت ہوتی ہے اور اسی فرار میں اسے اپنی محافظت وبقا نظر آتی ہے۔

۲۔ مایوسی۔۔۔ یعنی انسان جس تصور کا قیام چاہتا ہے اس کے متعلق وہ متعلقہ افراد سے مایوس ہوجاتا ہے اور اپنی جماعت الگ بنالیتا ہے اس میں بھی سعی پیہم سے گریز کا جذبہ ہوتا ہے۔

۳۔ غرور یعنی اپنے متعلق مغالطہ نفس۔۔ گویا وہ سمجھتا ہے کہ ہمارے پاس جو کچھ بھی ہے وہ ایسا جامع ہے کہ اس کے بعد کسی چیز کی ضرورت نہیں اسی اساس پر وہ الگ گروہ بندی کرلیتا ہے۔

۴۔ ہوس اقتدار۔۔۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ایک انسان یہ محسوس کرتا ہے فلاں تنظیم میں شامل رہنے سے میری ہستی نمایاں نہیں رہے گی یا لیڈرشپ دوسروں کے حصے میں آجائے گی۔ اس جذبے سے وہ کوئی نہ کوئی نکتہ نکال کر ایک علیحدہ گروہ قائم کرلیتا ہے۔

۵۔ محض فتنہ پسندی یا بے وقوفی۔۔ اس میں دراصل کوئی مقبولیت نہیں ہوتی۔ لیکن اپنے طرز عمل کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے کئی نکات پیدا کرلیے جاتے ہیں۔ یہ عموماً کسی کی انگیخت پر ہوتا ہے جس سے آگے چل کر کوئی صلہ ملنے کی توقع ہو۔

غرض اسی قسم کے اسباب ہوتے ہیں جن سے گروہ اور پھر گروہ در گروہ بنتے ہیں۔ اور غالباً تمام قوموں سے زیادہ اہل اسلام اسکا شکار ہوتے ہوئے ہیں۔ یہ تفریق کبھی سیاست کی وجہ سے ہوئی اور کبھی مذہب کے نام پر اختلاف اصولی بہت ہی کم نظر آئیں گے۔ زیادہ تر یہ تفریقات فروع سے شروع ہوئے اور فروع نے فروع پاکر اصول کی جگہ حاصل کرلی۔ یہ ایک عام قاعدہ ہے کہ جب فروع پر زیادہ زور دیا جائے تو اصول گم ہوجاتے ہیں۔ اتحاد عمل بہرحال اصول پر ہی قائم رہنا چاہیے۔ لیکن یہ فروعی اختلافات کے ہنگاموں میں ایسا گم ہوجاتا ہے کہ اتحاد اگر محال نہیں تو دشوار تر ضرور ہوجاتا ہے۔

لایعنی مسائل کی مصیبت

ایک بڑی مصیبت یہ ہوئی ہمارے معاشرے میں اتحاد عمل کو پارہ پارہ کرنے والے اختلافات کوئی اہم مسائل نہ تھے۔ بعض بالکل بے ضرورت اور بعض قطعاً فروعی وجزئی۔ ''مسائل'' دراصل وہ ہیں جن کو ہم مسائل زندگی کہتے ہیں نہ کہ وہ جن کا تعلق نہ عملی زندگی سے ہے اور نہ

آخرت میں اس کے متعلق کوئی باز پرس ہوگی۔ مثلاً معاشرے میں کبھی ایک علمی مسئلہ خواہ مخواہ چھڑ گیا کہ خدا جھوٹ بول سکتا ہے یا نہیں؟ تو اولاً تو اس لایعنی مسئلے کی قوم کو دنیا یا آخرت میں کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے اس پر کسی قسم کی گفتگو ہی بے ضرورت تھی۔ لیکن اس پر مکالمے اور مناظر شروع ہو گئے اور دو مکاتب فکر سامنے آ کر قوم دو گروہوں میں تقسیم ہو گئی۔ اس کا آسان حل یہ تھا کہ بھئی مسئلے کی نوعیت کچھ بھی ہو آؤ ہم تم جھوٹ نہ بولا کریں اور سچائی کا ساتھ دیں۔ اور اس باب میں باہمی تعاون سے کام لیں اور دروغ کا فروغ نہ ہونے دیں۔ اسی طرح اس بحث کو ترک کر دیں کہ قرآن مخلوق ہے یا غیر مخلوق ہے۔ آؤ ہم سب ملکر قرآن کو اپنی عملی زندگی میں سمو لیں۔ یوں ہی اس مسئلے پر گفتگو نہ کریں کہ حضور ﷺ کو خدا نے عالم الغیب بنایا تھا یا نہیں۔ بس آؤ ہم اپنے علم و فن میں بیش از بیش اضافہ کرتے جائیں۔ سیدنا مسیح علیہ السلام زندہ ہیں یا نہیں؟ اس سے ہمیں کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ ہمارا فائدہ اس میں ہے کہ ہماری قوم خود زندہ ہو۔ امام مہدی ابھی تک غار سامرہ میں چھپے بیٹھے ہیں یا نہیں! اس سے قوم کو کوئی فائدہ نہیں۔ قومی مفاد اس میں ہے کہ ہر فرد قوم اپنے طرز عمل سے مگاہ خداوندی میں ہادی و مہدی قرار پائے خلافت رسول ﷺ کے اصل مستحق حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے یا حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ؟ اب اس بحث میں کوئی فائدہ بجز تفریق کے حاصل نہیں۔ اس وقت ہمارا کام یہ ہونا چاہیے کہ دنیا میں نظام خلافت قائم ہو۔

ان ذہنی عیاشیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک فرقہ دوسرے فرقہ کے پیچھے نماز ادا نہیں کر سکتا۔ اور "مساجد اللہ" میں بھی تفریق ہو گئی۔ ایک گروہ دوسرے گروہ کی نماز جنازہ نہیں پڑھتا۔ بلکہ ایک "پارٹی" دوسری "پارٹی" کو خارج از اسلام تصور کرتی ہے۔ ہماری تاریخ ایسے مال و جدال کی داستانوں سے رنگین ہے جس کی بنیاد اسی قسم کے غیر ضروری اور اختلافی مسائل پر رکھی گئی تھی۔ دوسرا نقصان یہ ہوا کہ مسائل کی غیر ضروری موشگافیوں کی عادت پڑ گئی۔ پاکستان کے ایک مشہور شہر میں کچھ عرصہ قبل یہ بحث چھڑ گئی تھی کہ اصحاب کہف کے کتے کا رنگ سفید تھا یہ سیاہ۔ ہندوستان کے ایک شہر میں اہل علم کے درمیان اس مسئلے پر مناظرہ ہوا کہ براق کا گوشت حلال ہے یا حرام؟ سبحان اللہ وبحمدہ

جب اس قسم کے لایعنی مسائل چھڑ کر فرقے بندیاں پیدا ہو جائیں تو روح تعاون بالکل ختم ہو جاتی ہے اور اجتماعیت کی اسپرٹ گیس بن کر اڑ جاتی ہے۔ اور یہ تقریباً محال ہو جاتا ہے کہ ایک فرد دوسرے فرد کی یا ایک فرقہ دوسرے فرقے کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھائے یا اپنی صلاحیتوں سے دوسروں کو فائدہ پہنچائے پھر وہ گویا ایسے نابینا اور ایسے لنجے بن جاتے ہیں جو آگ لگنے پر بھی افادہ و استفادہ کے فلسفے پر عمل کرنے سے قاصر و محروم رہتے ہیں۔ اور جل مرنا انہیں زیادہ عزیز ہوتا ہے۔

قرآنی ہدایت

قرآن نے اسی کافرانہ و مشرکانہ انداز و زیست سے یوں روکا ہے کہ:

ان الذین فرقوا دینھم و کانو شیعاً لست منھم فی شیء۔

جو لوگ دینی فرقے اختیار کر کے گروہ گروہ ہو جاتے ہیں اے رسول! تمہارا ان سے کچھ واسطہ نہیں۔

نیز یہ بھی فرمایا کہ:

ولا تکونو من المشرکین من الذین فرقو دینھم وکانو شیعاً۔

دیکھو مسلمانو! تم ان مشرکین کی طرح نہ ہو جانا جو دینی فرقے بندیاں پیدا کر کے گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔

ان دونوں تہدید آمیز آیتوں پر غور کیجئے۔ ان میں دینی فرقے بندی کو کفر اور شرک دونوں ہی قرار دیا گیا ہے۔ دینی فرقے بندی کا مفہوم یہ ہے کہ ایک فرقے کی ہر بات کی حمایت اور دوسرے کی ہر چیز کی مخالفت ضروری سمجھ لی جائے۔ اسی طرح کی حمایت و مخالفت کسی دلیل یا معقولیت کی بناء پر نہیں ہوا کرتی بلکہ اس میں صرف عصبیت کارفرما ہوتی ہے اور اسی کا نام قرآنی اصطلاح میں حمیۃ الجاھلیہ ہے۔

اجتماعیت اور تفریق دو متضاد جذبے ہیں جو ایک جگہ کبھی جمع نہیں ہو سکتے اس لیے یہ ممکن نہیں کہ قرآن دونوں کی تائید کرے وہ ایک ہی چیز کی تائید و تاکید کرتا ہے۔ (واعتصمو بحبل اللہ جمیعاً) اور دوسری سے پورے زور کے ساتھ روکتا ہے۔ (ولا تفرقوا)

جن غیر ضروری مسائل پر امت میں جدال وقتال ہوتا رہا ہے ان کی کوئی اہمیت زندگی میں نہ تھی اور نہ آج ہے۔ اس وقت تو ہمارے مسائل اور ہی ہیں۔ ہمارے مسائل یہ ہیں کہ دینی شعور کس طرح پیدا کیا جائے؟ بے روزگاری کیسے دور ہو؟ آبادکاری کیونکر ہو؟ اخلاقی تربیت کی کیا سبیل ہو؟ تعلیم کا کیا نظام ہو؟ ہمارے ملک کی بین الاقوامی ساکھ کس طرح بلند ہو؟ دوسرے ممالک سے ہمارے تعلقات کس نوعیت کے ہوں؟ صحت عامہ کس طرح بحال کی جائے؟ صنعت وحرفت میں کیونکر ترقی کی جائے وغیرہ وغیرہ۔ یہ ہیں آج کے مسائل جو صرف فلسفیانہ اور مناظرانہ موشگافیاں نہیں چاہتے۔ علمی حرکت چاہتے ہیں۔ یہ ذہنی عیاشیاں نہیں بلکہ قوم و ملک کی بقا کا دارومدار ان ہی مسائل پر ہے۔ اس میں ہمارا صرف زبانی اتحاد مطلوب نہیں بلکہ جو شغف ہمیں غیر ضروری مسائل سے رہا کیا ہے اس سے کہیں زیادہ بے چینی ان مسائل کو حل کرنے میں درکار ہے۔ اتنی زیادہ بے چینی اور شغف مطلوب ہے کہ تفریق امت پیدا کرنے والے مسائل ان میں دب کر ختم ہو جائیں۔

علمی مسائل پر گفتگو بری چیز نہیں بلکہ بعض مرحلوں پر ضروری ہوتی ہے۔ ہر چیز پر اتفاق رائے ہونا بھی ضروری نہیں۔ اس لیے ایسی علمی گفتگو سے۔۔۔ بشرطیکہ اس سے امت میں دینی تفریق نہ پیدا ہو بہت سے پہلو سامنے آجانے کی وجہ سے دماغ وذہن میں روشنی پیدا ہوتی ہے اور جمود ٹوٹتا ہے۔ اس لیے ہم اس میں تو کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے لیکن اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ اصل مسائل زندگی سے ہماری دلچسپیاں کم نہ ہوں اور باہمی اختلاف رائے سے تفریق امت نہ ہو بلکہ ایک دوسرے سے استفادہ مقصود ہو۔ ہر ایک دوسرے کی صلاحیتوں سے فائدہ حاصل کرے اور اپنی صلاحیتوں سے دوسروں کو نفع پہنچائے یہی وہ روح اجتماع اور جذبۂ تعاون ہے جو قوم کے افراد کو ایک وحدت بنا دیتا ہے اور تمام مختلف صلاحیتیں اور توانائیاں سمٹ کر ایک مرکز پر آجاتی ہیں اور اس ارتکاز میں ایسی بے پناہ قوت پیدا ہو جاتی ہے جس کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ کمی صلاحیتوں یا توانائیوں کی نہیں جو کچھ کمی ہے وہ روح اجتماع اور جذبہ تعاون کی ہے اور ضرورت اسی خامی کو دور کرنے کی ہے۔

قرآن مجید اور احادیث سے "پرہیز" کے ثبوت پر دلائل

علامہ غلام رسول سعیدی
شیخ الحدیث دارالعلوم نعیمیہ کراچی
سابق رکن اسلامی نظریاتی کونسل (حکومت پاکستان)

علاج معالجہ کی بحث میں ایک اہم مسئلہ پرہیز کرنا ہے ہم نے اکثر ذیابیطس کے مریضوں کو مٹھائی، چاول اور میٹھے پھل کھاتے ہوئے دیکھا ہے۔ اگر ان کو منع کیا جائے تو وہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں اور ہم اللہ کی ان نعمتوں کو نہیں چھوڑ سکتے یہ کفران نعمت ہے۔ اور کئی لوگوں کو فخر سے یہ کہتے ہوئے سنا ہے صاحب ہم پرہیز نہیں کرتے پھر ہم نے ان ہی لوگوں کو اس بد پرہیزی کے نتیجے میں کئی مہلک امراض میں مبتلا دیکھا، کسی کی بینائی چلی گئی کسی کے جگر میں کینسر ہو گیا اور کسی کے پیر سوج گئے، کسی کو ایسا زخم ہو گیا جس کے نتیجہ میں اس کا پیر کاٹ دیا گیا کسی کی ٹانگ کاٹ دی گئی اور کسی کی شریانیں بند ہو گئیں۔ اسی طرح ہائی بلڈ پریشر کے مریضوں کو دیکھا جو بد پرہیزی کرتے تھے، کسی کے عضو پر فالج گر گیا اور کسی کے دماغ کا رگ پھٹ گئی، کسی کی بینائی متاثر ہو گئی۔ غرض بد پرہیزی کے نتیجہ میں لوگ زیادہ مہلک بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں اس لیے دواء کے ساتھ پرہیز بھی بہت ضروری ہے اور قرآن مجید میں پرہیز کے متعلق بھی ہدایات موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ

اَلنِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا۔ (النساء:۴۳، المائدہ:۶)

ترجمہ۔ اور اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو، یا تم میں سے کوئی قضائے حاجت کر کے آیا ہو، یا تم نے اپنی عورتوں سے مجامعت کی، پھر تم پانی نہ پاؤ تو تم پاک مٹی سے تیمم کرو۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس بیمار آدمی کو جسے پانی کے استعمال سے ضرر ہوتا ہے اس کو غسل اور وضو کے بجائے تیمم کرنے کا حکم دیا ہے اور تیمم کا حکم دینا پانی کے استعمال سے منع کرنے کو مستلزم ہے، اور جس بیمار کو وضو یا غسل سے ضرر ہوتا ہو اس کو تیمم کا حکم دینا ہی پرہیز کرنے کا حکم ہے۔

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک مرتبہ سردی کی شدت کی وجہ سے پانی کا پرہیز کیا اور غسل کے بجائے تیمم کرلیا۔

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ غزوہ ذات السلاسل کی ایک سرد رات مجھے احتلام ہو گیا، مجھے یہ خوف ہوا کہ اگر میں نے غسل کیا تو میں ہلاک ہو جاؤں گا ۔ میں نے تیمم کیا، پھر میں نے اپنے اصحاب کے ساتھ صبح کی نماز پڑھی، انہوں نے نبی ﷺ سے اس واقعہ کا ذکر کیا۔ آپ نے مجھ سے فرمایا اے عمرو! تم نے حالت جنابت میں اپنے اصحاب کے ساتھ نماز پڑھی ہے، میں نے آپ کو وہ سب بتایا جس کی وجہ سے میں نے غسل نہیں کیا تھا اور کہا میں نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد سنا ہے:

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ط اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا۔ (النساء:۲۹)

ترجمہ: اور اپنی جانوں کو قتل نہ کرو، بے شک اللہ تم پر بہت رحم فرمانے والا ہے۔

تو رسول اللہ ﷺ ہنس پڑے اور کچھ نہیں فرمایا۔ (سنن ابوداؤد رقم الحدیث:۳۳۴)

امام بخاری نے کتاب التیمم میں اس حدیث کا اختصار سے ذکر کیا ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ ایک زخمی شخص نے پانی سے پرہیز کیا اور وہ فوت ہو گیا تو نبی ﷺ نے اس پر افسوس فرمایا۔ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم ایک سفر میں گئے، ہم میں سے ایک شخص کو پتھر آ کر لگا اور وہ زخمی ہو گیا، پھر اس کو احتلام ہو گیا تو اس نے اپنے اصحاب سے پوچھا آیا کہ اس کے لیے تیمم کرنے کی رخصت ہے؟ اصحاب نے کہا ہم تمہارے لیے

رخصت کی گنجائش نہیں پاتے، جب کہ تم پانی استعمال کرنے پر قادر ہو اس نے غسل کیا اور وہ مر گیا جب ہم نبی ﷺ کے پاس گئے تو ہم نے آپ کو اس واقعہ کی خبر سنائی، آپ نے فرمایا: ان لوگوں نے اس شخص کو قتل کر دیا اللہ ان کو قتل کرے! جب تم کو مسئلہ معلوم نہیں تھا تم نے پوچھا کیوں نہیں؟ لاعلمی کا علاج تو صرف سوال کرنا ہے اس کے لیے تیمم کرنا کافی تھا یا پھر اپنے زخم پر پٹی باندھ کر اس پر گیلا ہاتھ پھیرتا اور باقی جسم کو دھو ڈالتا۔ (سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۳۳۶، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث:۵۷۲)

اس حدیث سے یہ واضح ہو گیا کہ مریض کے لیے پرہیز کرنا ضروری ہے اور بعض اوقات بد پرہیزی کا نتیجہ موت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور نبی ﷺ نے ان لوگوں کی مذمت کی جنہوں نے فتویٰ دینے میں سختی کی اور معذور کے حال کی رعایت نہیں کی رخصت کی جگہ عزیمت پر عمل کرنے کا حکم دیا۔ اس حدیث میں ان صوفیاء کے لیے عبرت کا مقام ہے جو کہتے ہیں بیمار کے لیے علاج کی رخصت پر عمل کرنا خلاف افضل ہے اور مکروہ تنزیہی ہے۔ اس شخص کے اصحاب نے بھی ان ہی کی طرح اس معذور شخص کو عزیمت پر عمل کرنے کا حکم دیا تھا جس کے نتیجہ میں اس کی موت واقع ہو گئی۔ نبی ﷺ نے ان لوگوں کی مذمت کی۔ اور اس حدیث میں یہ واضح دلیل ہے کہ جس شخص کو پانی سے ضرر ہو وہ پانی سے پرہیز کرے اور یہ حدیث پرہیز کے ثبوت میں بہت واضح دلیل ہے۔

نبی ﷺ نے خود بھی پرہیز کی ہدایت دی ہے اور بد پرہیزی سے منع فرمایا ہے:

حضرت صہیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں ہجرت کر کے رسول اللہ ﷺ کے پاس پہنچا اس وقت آپ چھوارے کھا رہے تھے میں نے بھی چھوارے کھانے شروع کر دیے اس وقت میری آنکھیں دکھ رہی تھیں، آپ نے فرمایا تمہاری آنکھیں دکھ رہی ہیں اور تم چھوارے کھا رہے ہو الحدیث (سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۳۴۴۳، المعجم الکبیر رقم الحدیث: ۷۳۰۲، مسند احمد ج ۴ ص ۶۱، المستدرک رقم الحدیث:۴۴۴۳)

امام احمد بن ابوبکر بوصیری متوفی ۸۴۰ھ لکھتے ہیں: اس حدیث کی سند صحیح ہے اور اس کے راوی ثقہ ہیں۔ (زوائد ابن ماجہ ص ۴۴۷ مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۴ھ)

علامہ سید محمد بن محمد حسینی الزبیدی متوفی ۱۲۰۵ھ لکھتے ہیں:

اس حدیث کو امام ابن ماجہ نے سند جید کے ساتھ روایت کیا ہے۔ علامہ ابن حجر مکی نے شرح الشمائل میں لکھا ہے کہ جو مریض کمزور ہو اس کے لیے سب سے نفع بخش چیز یہ ہے کہ وہ پرہیز کرے۔ بعض اوقات انسان کی رغبت اور میلان اس چیز کو کھانے کی طرف راغب ہوتا ہے جو اس کے لیے نقصان دہ ہوتی ہے۔ اور اس حدیث میں پرہیز کی طرف اشارہ ہے اور یہ کہ آنکھ کی تکلیف میں چھوارے نقصان دہ ہوتے ہیں۔ (اتحاف السادۃ المتقین ج ۵ ص ۲۷۰، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)

اس سلسلہ میں یہ حدیث بھی ہے:

حضرت ام المنذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتی ہیں کہ میرے پاس رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور آپ کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی تھے اور ہمارے پاس ادھ پکی (گدری) کھجوروں کا ایک خوشہ تھا، رسول اللہ ﷺ ان کھجوروں کو کھانے لگے، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی آپ کے ساتھ کھانے لگے، تب رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا: ٹھہرو، ٹھہرو یا علی، تم کمزور ہو، پھر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیٹھے رہے اور نبی ﷺ کھاتے رہے، حضرت ام المنذر نے کہا پھر میں ان کے لیے چقندر اور جو لائی، پھر نبی ﷺ نے فرمایا: اے علی اس میں سے کھاؤ، یہ تمہارے مزاج کے موافق ہے۔ (سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۳۸۵۶، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۰۳۷، مسند احمد ج ۶ ص ۳۶۳، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۳۴۴۲، المستدرک ج ۴ ص ۴۰۷)

اس حدیث میں پرہیز کے مشروع ہونے پر واضح دلالت ہے۔

نیز امام ترمذی روایت کرتے ہیں:

حضرت قتادہ بن نعمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب اللہ کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو اس کو دنیا سے اس طرح پرہیز کراتا ہے جس طرح تم میں سے کوئی شخص استسقاء کے مریض کو پانی سے پرہیز کراتا ہے۔ (سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۰۳۶، مسند احمد ج ۴ ص ۴۲۷، صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۶۶۹، المعجم الکبیر ج ۱۹ ص ۱۷، المستدرک ج

ان تمام احادیث سے یہ واضح ہو گیا کہ بیمار شخص کو ان چیزوں سے پرہیز کرانا ضروری ہے جو اس کی صحت کے لیے مضر ہیں، ہم اس جان کے مالک نہیں ہیں اور نہ ہم اس بدن کے مالک ہیں ہمارے پاس یہ جسم اور جان اللہ تعالیٰ کی امانت ہے، ہمارے لیے اس جسم کو ضائع کرنا یا نقصان پہنچانا جائز نہیں ہے اس لیے ذیابیطس کے مریض کو میٹھی اور نشاستہ دار چیزوں سے پرہیز کرانا ضروری ہے اور ہائی بلڈ پریشر کے مریض کو نمکین اور چکنائی والی چیزوں کے استعمال سے پرہیز کرانا ضروری ہے اور جس کے معدہ میں السر ہو اس کو بڑے گوشت، تیز مصالحہ جات اور ترش چیزوں سے پرہیز کرانا ضروری ہے اور جس کو یرقان ہو اس کو چکنائی اور گائے کے گوشت سے پرہیز کرانا ضروری ہے اور جس کو عارضہ قلب ہو اس کو انڈے، گائے کے گوشت اور چکنائی سے پرہیز کرانا ضروری ہے اور تمام مہلک بیماریوں میں بسیار خوری سے پرہیز کرنا اشد ضروری ہے۔

یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے
جنہیں تو نے بخشا ہے ذوق خدائی
دو نیم، ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی
دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو
عجب چیز ہے لذت آشنائی!
شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن
نہ مال غنیمت، نہ کشور کشائی!
خیاباں میں ہے منتظر لالہ کب سے
قبا چاہیے اس کو خون عرب سے!

اردو ترجمہ وحاشیہ ''تیسیر القرآن''

تحقیق وتبصرہ: لیفٹننٹ کرنل محمد اعظم

تمہید وتعارف

قرآن مجید وفرقان حمید کا ترجمہ اور تفسیر کوئی عام اور معمولی بات نہیں ہے۔ اس پر کوئی انسان قلم تب ہی اٹھا سکتا ہے جب اللہ تعالیٰ کی مدد اور توفیق شامل حال ہوتی ہے۔ دنیا میں بہت سے علماء نے ترجمے اور تفاسیر لکھنے کی کوشش کی ہے اور اپنے اپنے لحاظ اور انداز میں اپنی تمام تر قابلیت کو بروئے کار لاتے ہوئے قارئین تک بہترین مواد پہنچانے کی کوششیں کی ہیں۔ انہی میں ایک کوشش مولانا عبدالرحمٰن کیلانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی تیسیر القرآن (اُردو) کا ترجمہ اور تفسیر ہے۔

تیسیر القرآن (اُردو) کا ترجمہ اور تفسیر جدید انداز میں اسطرح کیا گیا ہے کہ جدید سائنسی، فنی، طبی اور تاریخی معلومات کا قرآنی آیات سے تقابل کے ساتھ ساتھ قرآن کے سائنسی معجزات کی وضاحت بھی کی گئی ہے۔ اس کا ترجمہ مولانا عبدالرحمٰن کیلانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اور حاشیہ حافظ عتیق الرحمٰن کیلانی نے تحریر کیا ہے۔ اس کو شائع کرنے کا شرف اسلامک پریس ''دارالسلام'' وسن پورہ لاہور پاکستان نے حاصل کیا ہے۔ خط عربی مولانا عبدالرحمٰن کیلانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی خودنوشتہ ہے۔ جبکہ اس پراجیکٹ کے انچارج انجینئر عتیق الرحمٰن عبدالرحمٰن کیلانی کو حاصل ہے جوانہوں نے بیت الحرام مکہ المکرمہ میں ۲۸ نومبر ۱۹۹۷ء الموافق ۲۸ رجب ۱۴۱۸ھ کو تحریر کیا جس میں اس تفسیر کے مختلف پہلوؤں کو بڑے جامع اور خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔

تیسیر القرآن (اُردو) ایک ہی جلد میں مکمل کی گئی ہے اور یہ ۱۲۹۲ صفحات پر مشتمل تفسیری نسخہ ہے۔

مولانا عبدالرحمٰن کیلانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

شخصیت اور حالات زندگی

۱۱ نومبر ۱۹۲۳ء کو کیلیانوالہ ضلع گوجرانوالہ میں مولانا عبدالرحمٰن کیلانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی ولادت ہوئی اور اسی نسبت سے کیلانی کہلائے۔ انکے والد محترم نورالٰہی ایک تہجد گزار اور متقی عالم باعمل انسان تھے۔ اس دور میں وہ قرآن پاک کے ماہر اور مشہور خطاط ہونے کی شہرت رکھتے تھے۔ اسطرح مولانا عبدالرحمٰن کیلانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے دینی اور دنیاوی تعلیم انتہائی اہتمام کے ساتھ حاصل کی۔ بچپن سے ہی آپکو قرآن کریم کے مطالب ومعنی سے خاصہ لگاؤ تھا۔ اور یہ ذوق عمر کے ہر حصے میں بڑھتا گیا۔ ۱۹۴۳ء میں متحدہ ہندوستان کے اس دور میں آپ نے بی اے کیا جب لوگ میٹرک پاس کو دیکھنے آیا کرتے تھے۔

آپ تصانیف میں بعض ایسی ہیں کہ ماہر تعلیم انکو پی ایچ ڈی کے مقالے کی تمام شرائط کے مطابق سمجھتے ہیں۔ ذریعہ معاش کے لئے دو سال فوج میں اکاؤنٹنٹ کے عہدے پر کام کیا لیکن اسلام مزاج ہونے کی بناء پر جلد اپنے آبائی پیشہ خطاطی کیطرف متوجہ ہوئے اور خوب نام پیدا کیا۔ پچاس کے قریب قرآن مجید ہاتھ سے تحریر کیئے۔ جو کہ تاج کمپنی اور فیروز سنز لاہور نے طبع کیئے۔ تیسیر القرآن (اُردو) میں بھی عربی خطاطی مولانا مرحوم کی اختیار کی گئی ہے۔ آپکی خطاطی کے کئی نادر نمونے عجائب گھروں اور نمائشوں کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ آپکے لگ بھگ ایک سو مقالات دینی رسائل میں شائع ہوئے۔ مقالات کے عنوان ''اصلاح معاشرہ'' اور پیغمبر اسلام داعی امن و اخوت تھے دو مرتبہ آپنے قومی سیرت کانفرنس میں انعام بھی حاصل کیا۔ آپکے تدریسی اور دینی کاموں میں سرفہرست تدریس القرآن والحدیث للبنات وسن پورہ لاہور کا قیام ہے۔ یہ مدرسہ آپنے اپنی انتہائی دینی ذوق رکھنے والی اہلیہ حمیدہ بیگم کے تعاون سے جاری فرمایا۔ جو خود بھی حافظ قرآن تھیں۔ خواتین کی دینی تعلیم وتربیت کے لیئے لاہور میں سب سے بڑا اور اہم مدرسہ یہی ہے۔ اس مدرسہ کا انتظام مولانا مرحوم کے بڑے صاحبزادے ڈاکٹر حبیب الرحمٰن کیلانی نے سنبھال رکھا ہے۔ جبکہ مدرسہ کے اندر کے معاملات مرحوم کی بیٹی خوش اسلوبی سے نبھا رہی ہیں۔

مولانا عبدالرحمٰن کیلانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ۷۲ سال کی عمر میں اس دار فانی کو خیر باد کہا۔ ۱۸ دسمبر ۱۹۹۵ء کی رات صلوٰۃ عشاء میں جب سجدے کو گئے تو دوبارہ نہ اٹھ سکے۔

تالیفات

مولانا عبدالرحمٰن کیلانی مرحوم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی (۲۰) بیس سے زیادہ تصانیف و تراجم ہیں جس میں اہم درج ذیل ہیں:

تصنیفات	صفحات
۱۔ رسول اکرم ﷺ بحیثیت سپہ سالار	۳۳۶
۲۔ عقل پرستی اور انکار معجزات	۳۴۴
۳۔ اسلام میں فاضلہ دولت	۷۲
۴۔ خلافت و جمہوریت	۳۲۰
۵۔ شریعت و طریقت	۵۲۸
۶۔ آئینہ پرویزیت	۱۰۰۸
۷۔ سعودی عرب میں نظام زکوٰۃ (اردو ترجمہ)	
۸۔ عربی کتب کے مجموعے کا اردو ترجمہ	
۹۔ فتاویٰ شیخ ابن باز (اردو ترجمہ)	
۱۰۔ تجارت اور لین دین کے مسائل	۳۷۲
۱۱۔ عذاب قبر اور سماع موتیٰ	۱۵۲
۱۲۔ الشمس والقمر بحسبان	۳۲۸
۱۳۔ مترادفات القرآن	۱۰۰۸
۱۴۔ احکام ستر و حجاب	۸۸
۱۵۔ الموافقات (امام شاطبی کی کتاب کا اردو ترجمہ)	
۱۶۔ قرآن نافہمی کے اسباب (اردو پمفلٹ)	
۱۷۔ سرگزشت نورستان (اردو پمفلٹ)	

۱۸۔ تفسیر قرآن کریم فصصل

۱۹۔ مریم اور نعمان (ایک اسلامی ناول)

اہل علم جنہوں نے تیسیر القرآن (اردو) کے مراجعہ اور پروف ریڈنگ میں مدد اور تعاون کیا۔

۱۔ ڈاکٹر صہیب حسن عبدالغفار (رئیس جمعیۃ القرآن۔ لندن)

۲۔ قاری محمد صہیب (فاضل کلیۃ القرآن۔ مدینہ یونیورسٹی)

۳۔ حافظ عبدالرحمٰن نعیم (مدیر دارالاصلاح السلفیہ۔ لاہور)

۴۔ عطیہ یاسمین (سیکریٹری انٹرنیشنل اسلامک فاؤنڈیشن۔ الریاض)

۵۔ عطیہ انعام (ایم اے گولڈ میڈلسٹ پنجاب یونیورسٹی۔ لاہور)

۶۔ رضیہ مدنی (سیکریٹری اسلامک ویلفیئر ٹرسٹ۔ لاہور)

اس ترجمہ اور تفسیر کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتب کو سامنے رکھا گیا ہے۔

۱۔ تفسیر مفعل غیر مطبوعہ۔ مولانا عبدالرحمٰن کیلانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

۲۔ تیسیر الکریم الرحمٰن فی تفسیر کلام المنان۔ العلامہ الشیخ عبدالرحمٰن بن ناصر العری

۳۔ تفسیر طبری۔ ابی جعفر محمد بن جریر طبری

۴۔ تفسیر جلالین۔ جلال الدین محمد بن احمد اور جلال الدین عبدالرحمٰن السیوطی

۵۔ تفہیم القرآن اور مختصر حواشی۔ مولانا مودودی

۶۔ فی ظلال القرآن۔ سید قطب

۷۔ احسن البیان۔ حافظ صلاح الدین یوسف

۸۔ اشرف الحواشی۔ ترتیب شیخ الحدیث مولانا محمد عبدہ الفلاح

۹۔ خصائص القرآن۔ ڈاکٹر فہد عبدالرحمٰن سلیمان الرومی

۱۰۔ احکام القرآن۔ زاہد ملک

Seminar Library
Department of Islamic History
University of Karachi

۱۱۔کتب حدیث صحاح ستہ اور کمپیوٹر پروگرام Hadeeth Encyclopedia

12. The Nobel Quran (9 Vol) Dr. Muhammad Muhsin Khan

13. Merit Student Encyclopedia

14. Guinness Encyclopedia. Dr. Robert M. Youngson

15. Complete Home Medical Guide. Columbia University

16. Bible, Quran and Science. Dr. Maurice

17. A Brief Guide of Understand Islam. I. A. Ibrahim

18. Quran for Astronomy and Earth Exploration from space. S. Waqar A. Hussaini

تیسیر القرآن کے ابتدائی صفحات اور آخری صفحات میں قارئین کی رہنمائی کے لیئے بہت سے موضوعات کی وضاحت کی گئی ہے۔جس سے قرآن سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔یہ موضوعات مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔قرآن کیسے حفظ کریں طریقے اور گائیڈ

۲۔عربی مادوں والے الفاظ اور انکے مترادف کی فہرست

۳۔جدید سائنسی تحقیقات کا تقابل

۴۔لفظی یا بامحاورہ ترجمہ میں اعتدال کی راہ

۵۔قرآنی مضامین کے موضوعات کی فہرست اور الف بائی انڈکس

۶۔رموز واوقاف قرآن مجید

۷۔مختصر احکام ترتین وتجوید

۸۔قرآن مجید کی سورتوں کی فہرست

تیسیر القرآن کے اہم نکات اور تفصیل

تیسیر آالقران (اردو) بارہ سو بانوے (۱۲۹۲) صفحات پر مشتمل تفسیر ہے جس میں تقریباً (۲۰۰۰) دو ہزار مقامات پر صحیح احادیث یا قرآنی آیات کو ہی بطور تفسیر پیش کیا گیا ہے۔

قرآن کے سائنسی معجزات کی وضاحت کثرت سے کی گئی ہے۔یعنی قرآن کریم میں ایسے حقائق موجود ہیں جس کے بارے میں نزول قرآن کے وقت کا انسان کچھ بھی نہ جانتا تھا۔ یعنی اس وقت زمین کو ساکن قرار دیا گیا تھا۔جبکہ قرآن نے یہ اعلان کیا کہ تمام اجرام فلکی متحرک ہیں اور اس تفسیر میں جابجا ایسا تقابل نظر آتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ قاری کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ اور خاص کر آج کا نوجوان جو سائنسی دور کی پیداوار ہے۔ہر نئی چیز پر بحث کرنے کا عادی ہے۔ہر چیز کو سائنسی تناظر میں دیکھتا اور پرکھتا ہے۔یہ تفسیر ان تقاضوں کو پورا کرتی ہے اور یوں ایک مسلمان کے جذبۂ ایمان کو بڑھانے کا وسیلہ بنتی ہے۔

حفاظ اکرام کی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہر صفحہ (۱۵) پندرہ لائنوں پر ترتیب دیا گیا ہے۔تمام صفحات آیت کے خاتمے پر ختم ہوتے ہیں۔ہر صفحہ میں ترجمہ اور تفسیر کی ترتیب میں یہ احتیاط ملحوظ رکھی گئی ہے کہ کسی صفحہ کے ترجمے کا کچھ بھی حصہ دوسرے صفحے پر منتقل نہیں ہوا۔اس طرح ہر صفحہ کا ترجمہ اسی صفحہ پر پورا کیا گیا ہے۔نوجوان نسل چونکہ اردو ہندسوں سے کم واقف ہیں لہذا انکی سہولت کے پیش نظر حاشیہ میں انگلش ہندسے استعمال کیئے گئے ہیں۔

ترجمہ وتفسیر میں زیادہ سے زیادہ عربی مادوں والے الفاظ استعمال کیئے گئے ہیں۔اس لیے عربی نصر سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔بہت سارے عربی الفاظ اردو کے طور پر استعمال کیئے جانے سے قرآن سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔پھر اس طرح سمجھنے سے حفظ میں آسانی ہوجاتی ہے۔اور مفہوم سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے۔ہر صفحے کا حاشیہ اسی صفحہ پر ختم ہوتا ہے۔جس سے بار بار صفحہ الٹنے کی زحمت اٹھانا نہیں پڑتی اور کسی ایک موضوع کو ایک ہی جگہ پر بہتر طریقے سے سمجھا جاسکتا ہے۔

مولانا عبدالرحمن کیلانی رحمتہ اللہ تعالی علیہ نے کتاب "شریعت وطریقت" آئینہ

پرویزیت" اور "عقل پرستی اور انکار معجزات" وغیرہ میں منکرین حدیث اور عقل پرست باطل فرقوں کے رد میں ایسا اسلوب اختیار کیا جس میں دلائل کی کاٹ بھی ہے اور انداز کی نرمی بھی مگر معذرت خوانہ کی بجائے جارحانہ انداز ہے۔ اور انکی یہ جھلک اس تفسیر میں بھی خوب نظر آتی ہے۔

اس تفسیر میں یہ کوشش بھی نظر آتی ہے کہ یہ کسی مسلک کی ترجمان نہیں بلکہ قرآن وسنت کی روشنی میں وہ راستہ اختیار کیا گیا ہے کہ ہر مسلک کو قابل قبول ہو۔ اور یوں یہ تنقید کا سبب بھی نہیں۔

خلاصہ بحث

قرآن پاک کا ترجمہ اور تفسیر لکھنا خالصتاً اللہ کی توفیق سے ہی ممکن ہوسکتا ہے۔ مولانا عبدالرحمن کیلانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی یہ کوشش آجکل کے قارئین کے لیئے ایک نادر نمونہ ہے۔ جس سے ہر کوئی مستفیض ہوسکتا ہے۔ انسان غلطی کرتا ہے اور کئی خامیاں چھوڑ جاتا ہے لیکن اس نسخہ میں ایسی چیزیں نظر نہیں آتی ہیں۔ ہاں اگر یہ نسخہ موٹے الفاظ کے ساتھ بڑے صفحات پر بھی شائع ہوجائے تو وہ قارئین جو کم نظر رکھتے ہیں یا بڑھاپے کی وجہ سے نظر کمزور ہوگئی ہے بھی اس سے فائدہ اٹھاسکیں گے۔

کیا تونے صحرا نشینوں کو یکتا
خبر میں، نظر میں، اذان سحر میں!
طلب جس کی صدیوں سے تھی زندگی کو
وہ سوز اس نے پایا انہیں کے جگر میں!
دل مرد مومن میں پھر زندہ کردے
وہ بجلی کہ تھی نعرۂ لاتذر میں
عزائم کو سینوں میں بیدار کردے
نگاہ مسلماں کو تلوار کردے

تفسیر المسائل و الاحکام

ڈاکٹر محمد شکیل اوج

نبی کے صاحب کتاب ہونے کی بحث

سوال:۔ کیا ہر نبی اور رسول کا صاحب کتاب ہونا ضروری ہے۔ نیز یہ بھی بتایئے کہ کتاب سے کیا مراد ہے؟

میرے محترم! آپ کا سوال نہ صرف بہت عمدہ ہے بلکہ بتقاضائے جواب، میرے نزدیک ایک علمی وتحقیقی نوعیت کا حامل بھی ہے۔ آپ کے سوال کے دو جز ہیں۔ پہلے جز و کا مختصر ترین جواب تو یہ ہے کہ آپ اپنے سوال سے لفظ "کیا" کو حذف کردیں۔ باقی رہا یہ کہ کتاب سے کیا مراد ہے تو اس میں قدرے تفصیل ہے۔ میں اولاً آپ کے سوال کے دوسرے جزو سے جواب شروع کرتا ہوں۔ اور بعد میں اپنے مختصر ترین جواب کی تفصیل پیش کرتا ہوں۔

میرے محترم! المعجم المفهرس للالفاظ القرآن الكريم کے مطابق قرآن مجید، فرقان حمید میں لفظ الکتاب ۲۳۰ مرتبہ آیا ہے۔ جبکہ کتابا ۱۲ مرتبہ اور کُتُب اور کتبہ تین تین مرتبہ آیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ لفظ (یا الفاظ) ہر جگہ ایک ہی معنی میں نہیں آسکتے۔ اس لیے لفظ کتاب کے اصل اور بنیادی معنی کا دیکھنا بہت ضروری ہے۔

کتاب، کتب سے بنا ہے جس کے اصل معنی ہیں، دو چیزوں کا آپس میں جوڑنا، یا ملانا۔ منتشر افراد کو جمع کرنا۔ معنی معروف میں، کتاب کو، کتاب اس وجہ سے کہا جاتا ہے۔ کیونکہ اس میں حرفوں کو لفظوں کی شکل میں جوڑا جاتا ہے اور لفظوں کو جملوں کی صورت میں، پھر جملوں کو پیراگرافوں میں۔ اور پیراگرافوں کو کسی مضمون کی شکل میں جمع کردیا جاتا ہے۔ اور پھر وہی مضمون "کتاب" کی صورت میں پیش کردیا جاتا ہے۔ ذلک الکتاب لاریب فیہ (البقرہ/۲) میں لفظ کتاب اسی معنی میں آیا ہے۔ یعنی متفرق آیات کی جمع شدہ حالت، جو بصورت کتاب پیش کی

جارہی ہے۔

آیئے! اب میں آپ کو قرآن کے بعض مقامات دکھاتا ہوں کہ وہاں کتاب کس معنی میں آیا ہے۔ امید ہے کہ آپ یہ مقامات بہت دلچسپی اور پوری توجہ سے دیکھیں گے۔

۱۔ کتاب کے ایک معنی کسی لازمی حکم کے آتے ہیں۔ قرآن مجید میں اس معنی کی متعدد آیات دیکھی جاسکتی ہیں۔ مثلاً کتب علیکم القصاص (البقرہ/۱۷۸) تم پر بدلہ کو فرض کیا گیا ہے۔ کتب علیکم الصیام (البقرہ/۱۸۳) تم پر روزوں کو فرض کیا گیا ہے۔ کتب علیکم القتال (البقرہ/۲۱۶) تم پر قتال کو فرض کیا گیا ہے۔

۲۔ کتاب کے معنی کسی معاہدہ کے بھی آتے ہیں۔ مثلاً والذین یبتغون الکتاب (النور/۳۳) جو لوگ معاہدہ کرنا چاہتے ہیں۔

۳۔ کسی مدت کی آخری حد کو بھی کتاب کہا گیا ہے۔ مثلاً حتی یبلغ الکتاب اجلہ (البقرہ/۲۳۵) یہاں تک کہ مدت مقررہ اپنے اختتام کو پہنچ جائے۔

۴۔ کتاب کے معنی کسی خط یا پیغام کے بھی آتے ہیں۔ مثلاً اذھب بکتابی (النمل/۲۸) میرا یہ خط لے جاؤ۔ انی القی الی کتاب الکریم (النمل/۲۹) میرے پاس ایک معزز پیغام آیا ہے۔

۵۔ کتاب کا لفظ قانون کے معنی میں بھی آیا ہے۔ قرآن مجید نے محرمات نکاح کے بیان کے بعد فرمایا۔ کتب اللہ علیکم (النساء/۲۴) یہ اللہ کا قانون ہے، جو تم پر (فرض کیا گیا) ہے۔

۶۔ کتاب بمعنی نوشتۂ (تقدیر) بھی آیا ہے۔ مثلاً لولا کتب من اللہ ۔۔ الخ (الانفال/۶۸) اگر اللہ کے نوشتہ میں پہلے سے مقرر نہ ہوتا۔

۷۔ کتاب بمعنی لوح محفوظ کے آیا ہے۔ مثلاً وعندنا کتاب حفیظ (قٓ/۴) اور ہمارے پاس وہ لوح میں محفوظ ہے۔

۸۔ البتہ کتاب بمعنی احکام (قوانین) سب سے زیادہ آیا ہے مثلاً ویعلمھم الکتاب (جمعہ/۲) اور وہ (نبی محترم) انہیں احکام سکھاتے ہیں۔ والذین یمسکون بالکتاب (الاعراف/۱۷۰) اور جو قوانین الٰہی کے پابند ہیں۔ اسی لیے یہ لفظ قرآن مجید فرقان حمید پر خصوصیت کے ساتھ بولا

گیا ہے۔

۹۔ پھر جس طرح یہ لفظ پوری کتاب پر بولا گیا ہے۔ اسی طرح ایک سورۃ یا حصہ کتاب پر بھی بولا گیا ہے۔

۱۰۔ نیز یہ لفظ پچھلی شریعتوں پر بھی بولا گیا ہے۔

۱۱۔ ہر ایک نبی کی وحی پر بھی اسکا اطلاق ہوا ہے۔

۱۲۔ اور جملہ انبیائے کرام اور رسل عظام کی وحیوں پر بھی بحیثیت، مجموعی اسکا اطلاق ہوا ہے۔ (البقرہ/۲۱۳) (تفصیل ذرا آگے بھی آتی ہے)

میرے محترم آپ نے کتاب کے متعدد معنی، قرآن مجید کے متعدد مقامات سے ملاحظہ کیے۔ اب لگے ہاتھوں میں یہ بھی بتاتا چلوں کہ یہود، انبیاء علیہم السلام کے صحیفوں میں سے ہر صحیفے کو سفر کہتے تھے۔ جسکے معنی کتاب کے ہیں۔ اور عیسائیوں نے انہی صحیفوں کو بائبل (Bible) کا نام دیا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ بائبل اصلاً یونانی لفظ ہے۔ اور اس کے معنی بھی کتاب کے ہیں۔ اس طرح ان صحیفوں کے لئے Scripture کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے۔ جسکے معنی لاطینی زبان میں کتاب کے ہیں۔ دراصل ان صحیفوں کو کتاب کہنے کی وجہ تسمیہ یہی ہے کہ یہ احکام و قوانین کا وہ مجموعہ ہے۔ جسے یکجا کر دیا گیا ہے۔ اس لئے میرے بھائی! جب ہم تمام انبیاء و رسل کو صاحب کتاب کہتے ہیں تو اس کا مطلب ان کا صاحب حکم یا احکام ہونا ہوتا ہے۔ قطع نظر اس کے کہ وہ احکام زبانی ہوں یا تحریری۔ اور امام راغب اصفہانی (متوفی ۵۰۲ھ) کے بقول اللہ کا کلام، کتاب کہلاتا ہے خواہ وہ مکتوب ہو یا غیر مکتوب۔

اتنی وضاحتوں کے بعد آپ یقیناً سمجھ گئے ہوں گے کہ انبیاء کے صاحب کتاب ہونے کے معنی کیا ہیں۔ واضح رہے کہ اسی معنی میں نبی و رسول کے صاحب کتاب ہونے کے دلائل قرآن میں متعدد مقامات پر موجود ہیں۔ جنہیں ہم ذیل میں درج کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ جواب کی طوالت بجائے بار خاطر بننے کے آپ کو ذہنی سکون اور قلبی اطمینان مہیا کرنے کا سبب بنے گی۔

اس سلسلے کی پہلی آیت ملاحظہ ہو۔ فبعث اللہ النبیین و مبشرین و منذرین وانزل معھم الکتاب بالحق لیحکم بین الناس فیما اختلفوا فیہ ۔الی الاٰیہ۔ (البقرہ/۲۱۳)